تحقیقِ

حیاتِ آخرت

(حیات بعد الممات)

(انسانی سوچ وفکر کو درپیش ایک دائمی مخمصہ)

الہامی رہنمائی اور جدید سائینسز کی روشنی میں
ایک عقلی، منطقی، تقابلی جائزہ

از

اورنگزیب یوسف زئی

فہرستِ ابواب

پیش لفظ

ہماری مذہبی دنیا میں حیاتِ آخرت کا حتمی تصور ایک انتہائی عیش ونشاط سے لبریز، خالص جسمانی زندگی کا ایک ثانوی، لیکن ہیشگی کی خصوصیات رکھنے والا، ایسا دور ہے جہاں کرنے کی لیے کوئی کام ہے نہ ذمہ داری، نہ جبر نہ پابندی۔ فقط آرام ہی آرام ہے۔ جنت کی ان گنت نعماء ہیں اور اس پر مستزاد، سدا بہار کڑیل جوانی۔ یعنی کریلا اور وہ بھی نیم چڑھا۔ پھر رہنے کو پر تعیش محلات، پینے کو شرابِ طہور، کھانے کو خوشبودار لحمِ طیور، اور لذتِ کام ودہن کے دیگر بیش بہا اور قوت بخش لوازمات۔ یعنی یہ عالم کہ بقولِ شاعر:

یہ عالم، یہ بت خانۂ چشم وگوش جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش

نیز سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمہ وقت تمتع کے لیے دستیاب، سدا کنواری، بلوریں جسم اور بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں کی مالک، جنت کی تر و تازہ حوریں۔ وہ بھی درجنوں نہیں بلکہ ستّر ستّر ہزار کی نفری میں۔ ہماری مقدس مذہبی پیشوائیت کے لیے یہ آخری نعمت کیونکہ تمام تر تگ وتازِ حیات کا منتہاء ومقصود ہے، لہذا یہاں ذرا رُک کر ایک شعر پیش کرنے کو دل چاہتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

امیدِ حُور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو یہ حضرت دیکھنے میں بھولے بھالے سیدھے سادھے ہیں

پھر، دائمی موسمِ بہار، مستقل پکنک کا سماں، نہروں کے کنارے باغات در باغات، خیموں کی قطاریں، ٹھنڈا گھنا سایہ، دودھ اور شہد کی بہتی ندیاں۔ متقین کے پاکباز دلوں میں پیدا ہونے والی ہر ممکن وناممکن خواہش کی چشمِ زدن میں مجسم شکل میں تعمیل، خدمت کے لیے ہمہ وقت مستعد حسین، خوب رو اور کمسن اغلام اور مصاحبت کے لیے فرشتے۔ سونے چاندی کے منقش پیالے، ریشم وحریر و بروکیڈ کے اعلیٰ لباس، آرائش کے لیے موتی ٹکے سونے کے کنگن، سجی ہوئی آرام دہ شاہی نشستیں وغیرہ وغیرہ۔ اور جوانی کے گزر جانے کا موہوم سا اندیشہ بھی ناپید۔ اور اس حسرتِ ناتمام سے مکمل نجات جو عدؔم کے اس شعر سے ہویدا ہے:

کہتے ہیں عمرِ رفتہ کبھی لوٹتی نہیں جا میکدے سے میری جوانی اٹھا کے لا

غرضیکہ تصور کی پرواز، مادہ پرستی کی اساس پر مرتکز، خون وگوشت سے بنے جسم کی دوبارہ بازیافت اور جسمانی لذتوں کے حصولِ نو کی خواہش سے ذرا بھی بلند نہ ہونے پر مصر ہے۔ کاش کہ سب کچھ ایسے ہی وقوع پذیر ہونے کی کوئی گنجائش ہوتی، تا کہ حضرت صاحبان کی تسکینِ قلب وجاں کا ساماں، اور بعد از مرگ صنفِ نازک کی صحبتِ جاناں سے محرومی کے درد کا درماں ہو جاتا۔ مگر وائے افسوس کہ ایسا نقشہ کسی طور نظر نہیں آتا۔ روایتوں کی بھول بھلیوں میں گم، دیومالائی افسانوں کے تخیلاتی پیکروں میں زندگی گزارنے والوں کے لیے

آخرت کا سامنا ایک شدید دھچکے اور عظیم صدمے کا موجب ہوگا۔ گمانِ غالب یہی ہے کہ زبانِ حال سے بے ساختہ پکار پکار کر گریہ کر رہے ہوں گے کہ:

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

دراصل صدیوں کے انسانی تجربات کی رُو سے زندگی کی اصل و حقیقت روایات کی دنیا سے یکسر مختلف و متضاد ثابت ہوتی ہے۔

معزز قارئین، الہامی صحیفہِ آخر میں، آیات ۵۵/ ۲۶۔۲۷ کے حوالے سے جب یہ فرمایا گیا کہ [کل من علیھا فان، و یبقی وجه ربک ذو الجلالِ والاکرام]، تو اس ارشاد باری تعالیٰ کے ذریعے دراصل یہ یاس بھری حقیقت بیان کی گئی کہ [زندگی کی جو بھی شکل اس زمین پر اپنا وجود رکھتی ہے، وہ بالآخر فنا کے گھاٹ اترنے والی ہے، جب کہ بقاء صرف تیرے پروردگار کی لافانی ذات کے لیے ہے، جو صاحبِ جلال و اکرام ہے]۔

ربِ ذوالجلال کو تو اس مقام پر غالباً اپنی ذاتِ عالی مقام کی حقیقت بیان فرمانا مقصود تھا، جو اُس مالکِ کون و مکان نے خالق و مخلوق کی حیثیتوں کا تعین فرماتے ہوئے ایک خاص نکتہِ تقابل کے پیرائے میں بیان فرما دی۔ تاہم یہ حقیقت حضرتِ انسان کی چشمِ بصیرت کے سامنے حسرتوں اور محرومیاں کا ایک لامتناہی دشتِ ویراں کھول گئی۔

کیا واقعی انسان کو ایک خود آگاہ و باشعور زندگی اس لیے عطا ہوئی ہے کہ وہ ہر آن و ہر ساعت ایک پرہول انجام سے خوفزدہ، ایک بے مقصد عمر بسر کرے جس کی منزلِ مقصود [لا ۔nihilism] یعنی فنا کے ناتمام اندھیرے ہوں؟ کیا نوعِ انسان وہی ذاتِ بے وقعت ہے جس کے بارے میں یہ کہا گیا کہ: [ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے]؟۔۔۔ایسا کچھ تو اُس ذاتِ رحیم و حکیم سے متوقع نہیں ہونا چاہیے تھا۔ پھر یہ کہ ایسا ہی کچھ تو زندگی کے بارے میں اس زمین پر موجود ہمارے مادہ پرست ساتھیوں کی روز افزوں بڑھتی ہوئی تعداد بھی باور کرتی اور برملا اظہار کرتی ہے۔ یعنی زندگی کا انجام فنا ہے، اور مادے کا انجام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر بے جان مادے میں مل جانا ہے۔ اور اگر واقعی ایسا ہی ہے تو پھر ایک تواتر کیساتھ آسمانی ہدایت نامے اور ضابطہ ہائے کردار کا نزول کس لیے؟ عظیم انسانوں کا مصلحین کے رُوپ میں مبارک ورود کس غرض سے؟ کیسی نیکی اور کیسا ایثار؟ کیسا اخلاق، رشتہ و پیوند، اور کون کس کا جاں نثار؟ کس کام کی محبت، انسانیت، اصول پرستی، امن و آشتی اور پیار؟ یہ تو وہ انجام ہے جو سراسر ایک خود غرض زندگی، نفس پرستی کی روش اور میسر وقت کی محدود گھڑیوں سے ضمیر کی پروا کیے بغیر بھرپور لطف اندوزی کی طرف مائل کرتا ہے۔ اور تمام تر متفقہ عالمی اقدار، اور اخلاقِ عامہ کے سارے مسلمہ اصول و قوانین سب باطل ہو جاتے ہیں۔ قصہِ مختصر یوں کہ [بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست]!

لیکن پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ارشادِ ربانی، بحوالہ آیت ۹/۱۰۰، میں کچھ خاص لوگوں کے بارے میں یہ خوش کن خبر سناتا ہے کہ "وہ جو اللہ کے مشن کی تکمیل میں سبقت لینے میں پہل کر گئے، وہ جو ہجرت کرنے والوں اور ان کے مددگاروں میں سے تھے، اور وہ بھی جنہوں نے احسان [voluntarily] کے انداز میں ان کی متابعت کی، اللہ تعالیٰ ان کے کردار سے رضامند ہوا اور وہ اللہ کی رضا میں خوش ہوئے، اور اس نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کیے جن کے نیچے نہریں رواں دواں ہیں، اور جن میں وہ ہمیشہ رہینگے۔ یہی تو عظیم کامیابی ہے"۔

اسی طرح عظیم قرآنی فلاسفر حضرت علامہ اقبال نے بھی فرمایا کہ:

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں　　ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

تو مایوسی و محرومی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں امید کی روشنی پھوٹ پڑتی ہے اور خزاں رسیدہ سوچیں آمدِ بہار کی توقع سے جاگ اٹھتی ہیں۔ اعمال صالحہ کی شکل میں بقائے حیات دُور ایک مینارہِ نور کی طرح نظر آنے لگتی ہے، اور زندگی کی تمام خوشگوار قدریں انسان کو بے ساختہ اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیتی ہیں۔ آسمانی ہدایت کا نزول اور پیغمبروں کی آمد کا جواز سمجھ میں آنا شروع ہو جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر اُس مرحلہِ شعورِ ذات کی وجہِ تخلیق آشکار ہونے لگتی ہے جس مرحلہِ عالیہ پر انسانی زندگی کو فائز کیا گیا ہے۔

- - -

معزز قارئین، الہامی صحیفے کے درجِ بالا حوالہ جات اور حضرت علامہؒ کے فلسفیانہ کلام کی ایک جھلک (touch) سے یہ تأثر نہ لیا جائے کہ یہ تحریر کسی ماقبل سوچے سمجھے یا اندھے عقیدے کی پیروی میں لکھی جا رہی ہے، اور اس سبب سے قبل از تحقیق ہی یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ حیاتِ آخرت ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ، جیسا کہ آپ ملاحظہ فرمائیں گے، کوشش یہ کی گئی ہے کہ موضوع کو تمام تر لکھے گئے مواد کی مدد سے عقلیت پسندی (Rationalism) کے معیار پر سمجھنے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ یہ تحقیق کی جائے کہ حضرت علامہ کی فکرِ عمیق نے جب یہ آواز بلند فرمائی کہ:

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں　　آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے، فنا ہوتا نہیں

تو انہوں نے "جوہرِ انساں" کی معنی خیز اصطلاح کس فلسفیانہ پیرائے میں استعمال فرمائی۔ یہ "جوہر" دراصل انسانی زندگی کے کس عنصر [element] کو کہا گیا۔ عدم اور فنا جیسے قطعی الفاظ سپردِ قلم کرنے وقت علامہ صاحب کی انسان شناس نظر، زندگی [life] کے کس پہلو کی کس حقیقت پر مرتکز تھی۔ اور جب قرآنِ حکیم جیسا معتبر اور مکرم صحیفہ، انسان کو ہمیشگی کی بشارت دیتا ہے تو کیا واقعی وہ ایک ایسے مرحلہِ حیات کی بات کرتا ہے جہاں عرصہِ حیات اس مادی زندگی کے تقابل میں کہیں طویل یا دائمی حیثیت کا حامل ہوگا۔ اگر ایسا ہے، تو یقیناً وہ آنیوالا مرحلہِ زندگی طبیعی یا جسمانی زندگی ہی کا ایک اور دور ہرگز نہیں بلکہ کسی اور نوع، یا کسی یکسر مختلف اندازِ حیات کا حامل ہوگا۔ کیونکہ

جیسا کہ وقت کی گردش سے ثابت ہے، موجودہ جسمانی نوعِ حیات تو عموماً لگ بھگ ایک سو سال کی حدودِ زمانی کے دائرے میں مقید رہتے ہوئے ہی اپنے حتمی انجام تک پہنچ جاتی ہے۔

قارئینِ گرامی قدر، زیرِ تحقیق عنوان دراصل ایک دقیق موضوع کی حیثیت کا حامل ہے اور اپنے تیئں ایک ضخیم کتاب کی سطح پر توضیح و تشریح کا حق رکھتا ہے۔ اس عنوان پر قلم اٹھانے کا ارادہ کرنا ہی ایک جوئے شیر لانے سے کم نہیں کیونکہ نامور شہسوارانِ فنِ تاریخ کے سبھی معروف ادوار میں اس پرصعوبت میدان کی ان دیکھی وانجانی وسعتوں میں فلسفیانہ خارہ شگافی کرتے اپنے اپنے مخصوص طرزِ اظہار، اور موافق و مخالف قرینوں میں، بیش قیمت ادب پارے ضبطِ تحریر میں لا چکے ہیں۔

تاہم یہ حقیقت بھی ہم سب پر عیاں ہے کہ آج تک اس موضوع پر عقلی قرینہ سے ایسا کوئی ٹھوس استدلال پیش نہیں کیا گیا جو رائے عامہ کے لیے اجتماعی سطح پر کسی حتمی، آخری اور قطعی فیصلہ تک پہنچنے میں مددگار ثابت ہو، اور کامل شرحِ صدر کا موجب بنے۔ سو، اس خاص میدانِ تحقیق میں رائے عامہ یکجا کرنے اور عوام الناس کے علمی افق کو قدرے وسیع تر کرنے کی غرض سے کچھ نہ کچھ علمی مواد اب بھی سپردِ قلم کرنے کی گنجائش موجود سمجھی جا سکتی ہے۔

اسی معروضی صورتِ حال میں جب کراچی سے محبی جناب حسین امیر فرہادؔ، ایڈیٹر موقر جریدہ، صوت الحق، کی جانب سے اس خاص موضوع پر لکھنے کا حکم صادر ہوا تو موضوع کی دہشت آفریں وسعتوں کے باوجود کچھ نہ کچھ سپردِ قلم کرنے اور علم کے پیاسوں کو اپنے حقیر فکر و ادراک میں شریک کرنیکی خواہش پیدا ہوئی۔ ویسے بھی فرہادؔ صاحب نے جس اصرار کے ساتھ محبت بھرے انداز میں فرمائش کی، اس کے پیشِ نظر معذرت کرنے کی کوئی گنجائش نہ پائی کہ موصوفِ محترم اس ناچیز کے لئے استاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ پس۔ اپنی کمیوں اور کوتاہیوں کیلئے پیشگی معذرت کے ساتھ یہ حقیر کوشش قارئین کے پیشِ خدمت ہے، اپنی ہستی کے بارے میں اس اعتراف کے ساتھ کہ،،،، چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک،،،،۔

بات کو سمجھنے اور سمجھانے میں یہ ناچیز کہاں تک کامیاب ہوا، فیصلہ کرنا آپ کا اختیار۔ البتہ از حد کوشش کی ہے کہ ہر ممکن اختصار کے ساتھ ایک سمندر کو کوزے میں سمیٹ دیا جائے تاکہ تحریر کا حجم کم سے کم بھی رہے اور مطالعہ کا دورانیہ بھی خوشگوار حدود میں رہ سکے۔ کیونکہ موضوع کی اتھاہ گہرائیاں حوصلہ شکن ہیں اور انسانی نطق کی حدود مختصر اور متعین، اس لیے اس مقام پر حضرت علامہ کا ایک اور شعر بار بار زبان پر مچل رہا ہے، جسے اپنی کوتاہیوں کے مزید اعتراف کے لیے، آپ کے ساتھ شریک کرنا چاہوں گا۔ آپ نے کسی مرحلۂ فکر پر ارشاد فرمایا تھا کہ:

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں　　　خدا مجھے نفسِ جبریل دے تو کہوں

پناہ بخدا! جس مرحلۂ تفکیر پر علامہ اقبالؒ جیسا بلند پایہ، عدیم النظیر اور ہمہ گیر نابغہ، جو خود کو عمر بھر کی فلسفیانہ آبلہ پائی کے تناظر میں "محرمِ رازِ درونِ مے خانہ" کی صفت سے متصف فرماتے تھے، اپنے دور کے علماء و فضلاء کو اسرارِ ہستی سمجھانے سے عاجز پاتے اور خود کے لیے نفسِ جبریل کی آرزو کرتے تھے، تو ہما شما کی کیا مجال کہ اصلِ حیات کو اس پیرایے میں پیش کر پائے کہ وہ ادراک کے نہاں خانوں کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ معزز قارئین، حضرت علامہ نے دراصل اس حقیقت کا اعلان فرمایا کہ نفسِ ناطقہ چند مخصوص امور کی تشریح و توضیح کے ضمن میں خود کو ایک حد سے آگے مجبور و بے بس پاتا ہے۔ انہیں اپنے باطن میں ہی مستور رکھنے پر مجبور ہے۔ شاید اس لیے کہ عمومی سطح پر زندہ انسان کا شعور اپنے تمام تر تحصیلِ علم کے باوجود ہنوز اپنے تکمیلی سفر کی رہگزر میں ہے اور کاملیت کی حد سے بہت دور۔

اگرچہ صحائف ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ حیاتِ آخرت ایک حقیقت ہے اور انسانوں کی اکثریت ان پر یقین بھی رکھتی ہے، لیکن جوں جوں آپ اس مطالعے میں قدم آگے بڑھائیں گے، یہ حقیقت از خود آشکار ہو جائیگی کہ حیاتِ آخرت کے الہامی اور مادی دونوں نظریات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اور دونوں ہی کے موافق اور مخالف پیش کیے گئے دلائل اور ثبوت غیر جانبدارانہ انداز میں زیرِ تحقیق لائے گئے ہیں۔

علاوہ ازیں، صحیفۂ آخر، یعنی قرآن سے حوالہ جات کے ساتھ ساتھ، فزکس، بایولوجی اور علمِ نفسیات کے دریافت شدہ مسلمہ قوانین کی بھرپور مدد سے بھی بات واضح کرنے کی پوری کوشش بروئے کار لائی گئی ہے تاکہ مضمون ہر طبقۂ خیال کے لیے کشش کا باعث ہو اور غیر جانبداری کا نمونہ قرار پائے۔ اگر قارئین سائنس کے عنوان کے تحت آنیوالے انتہائی ٹھوس، مدلل، منطقی، لیکن قدرے طویل اور خشک نظر آنے والے مواد کو اپنا قیمتی وقت عطا فرمائیں گے، تو اس ناچیز کا دعویٰ ہے کہ فلسفۂ تخلیق و فلسفۂ حیات کو سمجھنے میں جہاں جہاں، جس بھی سطح کی تشنگی اب تک پائی جاتی تھی اس کا یقینی مداوا ممکن ہے، اور یہی اس ناچیز کی خامہ فرسائیوں کا منتہیٰ و مقصود ہے۔ یہی وہ میدان ہوگا جو حیاتِ آخرت کو اس کی حتمی حدود تک واضح کرتے ہوئے صدقِ بسیط کی سمت تسلی بخش راہنمائی کی راہ کھول دے گا۔

اس تحریر کے پیشِ نظر وہی ٹھوس اسلوبِ بیان ہے جو اذہان میں اٹھنے والے سوالات کا تسلی بخش انداز میں جواب دیتا جائے اور آخرِ کار قاری کے لیے اپنا حتمی اور یقینی فیصلہ کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو۔ نہ کہ ایک فکری مخمصے میں الجھا چھوڑ جائے۔

تو آیئے قارئین آگے بڑھتے ہیں اور موضوع کے تفصیلی تعارف سے اس دلچسپ و عجیب، اور بادی النظر میں دیومالائی نظر آنے والے موضوع پر بحث کا آغاز کرتے ہیں۔ واللہ المستعان۔۔۔

موضوع کا تعارف اور پسِ منظر

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

حضرتِ انسان اپنی برتر تخلیقی (یا ارتقائی) سطح پر ایک طبیعی وجود (physical organism) کے ساتھ رہتا ہے، جس کے جبلی محسوسات میں زندگی کے تحفظ اور بقا کا شدید خودکار جذبہ بھی موجود ہے۔ اس لیے یہ اپنی فطرتِ طبیعی کی رُو سے موت کے لئے برضا و رغبت ہرگز آمادہ نہیں ہوتا۔ زندگی کے تحفظ اور بقا کی خواہش مرتے دم تک اپنا تسلط برقرار رکھتی ہے۔ یہ حقیقت بھی متفقہ علیہ ہے کہ یہ حضرت ایک شعوری وجود بھی رکھتا ہے جو تصوراتی پیکر (ideals) تراشتا رہتا ہے۔ اور وہ ان تصوراتی پیکروں کی تقلید کرتا اور ان سے محبت اور ان کی پرستش کرتا ہے۔ انسان کے اندر پایا جانے والے ہیرو ورشپ [hero worship] کا کھلا رجحان اسی آئیڈیلزم کا شاخسانہ اور واضح ثبوت ہے۔ کیوں کہ ان پیکروں کی قابلِ رشک صفات میں موت پر فتح۔۔اور ہیشگی۔۔کی خصوصیات ضرور پائی جاتی ہیں، اس لیے حضرتِ انسان کے نفس میں بھی ہیشگی کی نہ ختم ہونیوالی خواہش موجود رہتی ہے۔ انسانی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ صاحبانِ قوت و اختیار نے زندگی کے دوام اور موت کے ورود کو شکست دینے کیلیئے سر توڑ کوششیں کیں۔ دنیا کے مختلف خطوں میں مختلف تہذیبی ادوار میں انسانی اجسام کو بعد از مرگ حنوط کرنا اور انہیں دنیاوی ساز و سامان کے ساتھ محفوظ مقامات پر باحتیاط رکھ دینا بھی اسی انسانی خواہش کے تاریخی تقاضے کا ثبوت ہیں۔

فلسفے، مذاہب، دیومالاؤں اور فکشن میں آخرت، یا حیات بعد الممات، ایک ایسی انجانی اقلیم کا تصور ہے جو خواہ جسمانی سمجھی جائے یا روحانی، جس میں ایک ذات کی شناخت اور شعور، اس کی عمومی زندگی کے گزرنے کے بعد، اس کے جسم کی موت کے بعد بھی، زندہ رہتے ہیں۔ آخرت کے متعدد نظریات کے مطابق، ایک ذات کا وہ لازمی ہیولا جو موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے، اس کی ذات کا کوئی جزوی عنصر بھی ہوسکتا ہے یا اس کی مکمل روح بھی، جو اس کے ساتھ اگلے مرحلے میں صعود کرتی ہے اور اسے شخصی یا ذاتی شناخت دیتی ہے۔ حیاتِ آخرت پر یقین، جو فطری شکل بھی رکھ سکتا ہے اور فوق الفطری یعنی روحانی تصور بھی، ہمیشہ دائمی فنا کے نظریے کی ضد یا اس کے برعکس ہوتا ہے۔

کچھ قابلِ قبول نظریات کے مطابق، جسمانی موت کے بعد از سرِ نو جاری ہونے والی زندگی اکثر ایک روحانی دنیا میں وقوع پذیر ہوتی ہے اور کچھ دوسرے پسندیدہ نظریات کے مطابق، یہ دراصل انسانی ذات کی اسی دنیا میں پیدائشِ نو کو کہتے ہیں جہاں زندگی کا سفر ایک بار پھر شروع ہوتا ہے، امکانی طور پر کچھ اس انداز میں کہ انسان نے جو کچھ اپنے ماضی میں کیا ہوتا ہے اس کی کوئی یادداشت اس کے دماغ

میں محفوظ نہیں ہوتی۔ اس موخرالذکر نظریے کی رُو سے ایسی پیدائشِ نو اور اس سلسلے سے جڑی اموات بار بار بھی واقعہ ہوسکتی ہیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہ سکتا ہے جب تک کہ وہ ذات روحانی دنیا میں داخلے کے لیے مطلوبہ معیار حاصل نہ کرلے۔ حیات بعد الممات سے متعلقہ زیادہ اہم سمجھے جانے والے نظریات دراصل اپنے ماخذات مذاہب، روحانیات یا باطنی اور صوفیانہ علوم میں رکھتے ہیں۔

کچھ مذہبی سلسلوں میں، جیسے کہ وہ سلسلے ہیں جو حضرت ابراہیم کی نسل [posterity] سے جڑے ہیں، یہ مانا جاتا ہے کہ مردے ایک مخصوص حالتِ وجود میں منتقل ہوتے ہیں جس کا تعین ایک خدا، یا خداؤں، یا دیگر الہامی فیصلوں کے ذریعے ہوتا ہے، اور ان فیصلوں کی اساس وہ اعمال اور عقائد ہوتے ہیں جو مرنے والے نے طبیعی زندگی کے دوران انجام دیے ہوتے ہیں اور ان کی پیروی کی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، دوسری بارکی طبیعی زندگی کے نظریے میں، جیسے کہ دھارمک روایتوں میں پایا جاتا ہے، جاری رہنے والی زندگی کی نوعیت کا تعین براہِ راست اس ذات کے اعمال کی بنیاد پر کیا جاتا ہے جو اس نے ختم ہوجانے والی زندگی میں انجام دیے ہوتے ہیں، نہ کہ کسی دوسری ذات کی صوابدید پر۔

البتہ جتنی بھی تہذیبیں تاریخ کے مختلف ادوار میں کرہِ ارض پر عروج وزوال کے دائروں سے گذری ہیں یا ابدی ہلاکت کا شکار ہوکر معدوم ہوچکی ہیں، ان سب میں حیات بعد الممات کے تصور کی موجودگی ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔

قارئین گرامی قدر، آخر ایسا کچھ تو انسان کے باطن کی گہرائیوں میں موجود ہے جو اسے زندہ رہنے کی شدید خواہش دیتا ہے۔ اور انسان کیونکہ ہنوز اپنی ذات کی تعمیر کے مراحل سے گزر رہا ہے اور اپنی شعوری تکمیل سے ابھی بہت دور ہے، اس لئے وہ اپنی ذات کے اس تقاضے کو اس کی اصل روح کے ساتھ سمجھ نہیں پاتا۔ شاید انسانوں کی ایک بڑی تعداد خود کو ابھی تک ایک مادی پیکر ہی کی شکل میں شناخت کرتی ہے، اور مادے نے تو بالآخر فنا ہوکر مادے میں مل جانا ہے۔ تو پھر وہ کیا چیز ہے جو انسان کو ہمیشہ زندہ رہنے کی تڑپ اور تصور دیتی ہے؟ ابراہیمی مذاہب کے الہامی فلسفے کی رو سے تو وہ چیز انسانی روح ہے جسے موت نہیں آتی، اور جو اسکے طبیعی مادی جسم کی موت کے بعد ایک دوسرے اور بلند تر درجے میں منتقل ہوکر زندہ رہتی ہے۔ اسی کو عرفِ عام میں حیاتِ آخرت کہا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں جو فطری سوالات انسانی اذہان میں ابھرتے ہیں ان کی نوعیت کچھ اس طرح ہوتی ہے:۔

۱) کیا واقعی موت ہمیشہ کے لئے فنا ہوجانے کا نام ہے؟

۲) یا کیا انسانی زندگی درحقیقت موت کے بعد بھی زندہ رہتی ھے؟

۳) اگر حیات آخرت کا وجود ہے تو اس کی کیا شکل ہے؟

۴) کیا وہ مادی حیات ہے، یا غیر مادی، خاکی ہے یا نوری؟

۵) کیا ہمارے پاس آخرت کی زندگی کو ثابت کرنے کے لئے ٹھوس حقائق موجود ہیں؟

۶) کیا وہ حقائق ہمیں آسمانی صحیفوں سے ہی ملتے ہیں، جن پر آج دنیا کی آبادی کا ایک قابلِ لحاظ حصہ یقین نہیں رکھتا؟

۷) کیا وہ حقائق ہمیں سائینس یعنی فزکس اور بایولوجی اور علمِ نفسیات سے بھی ملتے ہیں جن کو آج سب سے زیادہ پذیرائی حاصل ہے، اور جن کی ثقاہت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا؟

ان سوالات کے جوابات کچھ اس طرح دیے جاسکتے ہیں کہ:

۱) ہاں، موت واقعی ہمیشہ کے لئے فنا ہو جانے کا نام ہے، لیکن صرف اس ذات کی فنا کا جو خالص طبیعی حیوانی وجود رکھتی ہے۔ اور یہ امر عمومی مشاہدے اور تاریخی تجرب سے ثابت ہے۔ اس لیے یہ حقیقت غالباً تمام نقطہِ ہائے نظر کی رُو سے متفق علیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

۲) انسانی زندگی کی اصل و بنیاد تو شعور (consciousness) ہے جو انسان کی ذہنی زندگی (mental life) کا دوسرا نام ہے، اور ایک خود آگاہ شعوری ذات کبھی فنا نہیں ہوتی کیونکہ وہ غیر مادی (non-material) وجود رکھتی ہے۔ یہاں کسی قدر اختلاف کی گنجائش ضرور پائی جاتی ہے اور اس اختلاف کو دور کرنے کیلیے یہ نقطہ پوری تفصیل سے زیرِ بحث لایا جائیگا۔

۳) شعوری ذات (روح) ہی حیات آخرت یعنی اگلے بلند تر مرحلہِ حیات میں داخل ہوتی یا ہو سکتی ہے۔ جو ایک غیر مادی سطح یا مرحلہ (stage) ہے۔

۴) شعور یا انسانی ذہن (mind) ایک غیر مادی وجود رکھتا ہے اس لئے اسے آپ نوری یا سائنس کی زبان میں توانائی (energy) کی ایک خاص قسم بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور سائیکولوجی کی اصطلاح میں (conscious self)۔ اس لیے متفقہ طور پر اسے مادی یا خاکی نہیں کہا جاسکتا۔

۵) ہمارے پاس علم میں بے پناہ ترقی کے باوصف ایسے ٹھوس حقائق موجود ہیں جو حیاتِ آخرت کا وجود ثابت کر سکتے ہیں۔

۶) وہ حقائق ہمیں آسمانی صحیفوں سے بھی ملتے ہیں، جنہیں آخری صحیفے یعنی قرآن کے حوالے سے آپ کے سامنے پیش کر دیا جائیگا۔ ان حقائق کو آج کے ترقی یافتہ دور کا جدید مادیت پرست (materialist) انسان درخورِ اعتناء نہیں سمجھتا کیونکہ وہ بوجوہ الہامی صحائف پر ایمان نہیں رکھتا۔

۷) اور وہ حقائق ہمیں سائینس سے بھی ملتے ہیں، جنہیں جھٹلانا بہت ہی مشکل کام ہوگا، کیونکہ ایسے حقائق کے رد کیلیئے کوئی اور، عمومی سطح پر قابلِ قبول، اور برتر سند دستیاب نہیں۔

یہ سب سوالات و جوابات ہم آئندہ صفحات میں ایک خاص ترتیب میں ثبوت و دلائل کے ہمراہ زیرِ بحث لائیں گے۔لیکن وہ سوالات جو اس کے بعد بھی تشنہِ جواب رہینگے ،وہ ہیں:۔

۱]　حیات دراصل کیا ہے؟

۲]　حیاتِ انسانی کا مقصد کیا ہے؟

۳]　کائنات اس تناظر میں کیا کردار ادا کرتی ہے؟

۴]　مادے،حرکت،توانائی،اور شعور کن چیزوں کے نام ہیں اور یہ کس سطح پر کیا کردار ادا کرتے ہیں؟

۵]　حیاتِ آخرت کے تناظر میں ہم ان سب کو کس شکل میں دیکھتے ہیں؟

قارئین،ان مشکل سوالات کے جوابات ہمیں سیر حاصل طور پر ہمارے سائنسی جز میں زیرِ بحث آتے ہوئے نظر آئینگے اور آپ ایک قیمتی مطالعے کے بعد حقیقتِ مطلق کو عین الیقین سے دیکھ پائیں گے۔ یا کم از کم اس عاجز کو اپنی ناچیز کوششوں کے نتیجے میں ایسی امید ضرور ہے۔

حضرتِ انسان تخلیقی پلان کی جس سطح پر پیدا کیا گیا، یا مادی نظریات کے مطابق جس ارتقائی سٹیج پر معرض وجود میں آیا، اس سطحِ زندگی میں جس نمایاں ترین عنصر کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں وہ حقیقت کو جاننے کا ایک موروثی تقاضہ اور انمٹ پیاس ہے، جو تخلیق کار نے، یا عملِ ارتقاء نے، اس کے خمیر میں ودیعت کر دی ہے۔ اور یہ وہ حقیقت ہے جس سے نہ روحانیت پرست انکار کر سکتے ہیں اور نہ ہی مادیت پرست۔

پس انسانی تہذیب کی صبحِ نو طلوع ہوتے ہی جو پہلا سوال ذہنِ انسانی پر نقشِ پائیدار کی مانند ثبت پایا گیا وہ تقاضائے علم و آگہی تھا۔ اس زمین پر ہوش سنبھالتے ہی انسان ایک تسلسل سے اپنے ماخذ کو جاننے اور اپنی منزلِ مقصود کی تلاش میں سرگرداں ہے۔وہ زمین پر اپنی زندگی کی حقیقت کو اور اس کے مقصد کو جاننا چاہتا ہے۔ اسی تلاش نے اسے مجبور کیا کہ وہ اپنے ارد گرد نظر ڈالے اور اس کائنات کی حقیقت اور اہمیت کو جاننے کی جستجو کرے۔

کائنات کی حقیقت جاننے کیلیئے انسان نے بے شمار نظریات سے کام لیا۔ اس نے دراصل کائنات کو اپنا آئیڈیل تصور کر لیا اور اسکے اسرار جاننا اپنی زندگی کا مقصد قرار دے لیا۔ پس انسانی تاریخ فی الحقیقت اس کے آئیڈیلز کے فروغ و ارتقاء کی تاریخ ہے۔ کیونکہ آئیڈیلز (مثالی پیکر) دراصل انسانی سوچ و فکر ہی کی پیداوار ہیں اور انسانی ذات سے علیحدہ، یا ماوراء، کوئی اہمیت نہیں رکھتے، اس لیے ہم آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ انسانی تاریخ دراصل انسانی شعور کے ارتقاء کی، یا انسانی ذات سے متعلق ہمہ وقت وسعت پذیر علم و آگہی کی تاریخ ہے۔

اسی ارتقاء پذیر انسانی فکر کیلیے حیاتِ آخرت کا مخمصہ ایک فوق الفطرت نظریے کی حیثیت سے ایک لاینحل سوال کی شکل میں سامنے کھڑا نظر آتا ہے اور علم و عرفان کے نئے پراسرار ابواب کھولنے کی دعوت دیتا ہے۔

حیاتِ آخرت کا اثبات لازمی طور پر ایک خالق کے وجود کے اثبات سے بھی جڑا ہوا ہے۔ اگر حیاتِ آخرت کا کوئی وجود ہے، تو ایک لافانی اور لامحدود قوت کا وجود بھی لازم ہے جو صرف حیاتِ آخرت کے مرحلے کا ہی نہیں بلکہ پوری کائنات اور اس میں کارفرما زندگی کی تمام اشکال و ہیات کا بھی خالق ہے۔ لامحالہ حیاتِ آخرت کی بحث خالق کے وجود کی بحث پر بھی منتج ہوگی۔ نیز اس ضمن میں طبیعی حیات اور موت کی حقیقت بھی زیر بحث لانی ہوگی۔

درپیش مہم طویل اور پر صعوبت ہے، لیکن آیئے قارئین، احتیاط کے ساتھ، قدم بقدم آگے بڑھتے ہیں۔

دو باہم متضاد نظریات

ہر چند کہ ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر

تاریخ کا بنظرِ غائر مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسانی شعور نے زندگی کے بارے میں اب تک عموماً دو بڑے اور اہم مکاتبِ فکر کا اتباع کیا ہے۔ ایک بڑے مکتبِ فکر کے مطابق، جو کہ جدید سائینسز پر مبنی ہے، انسان خالص مادہ ہے۔اور اپنی طبعی زندگی گزار کر مادے ہی میں فنا ہو جاتا ہے۔یعنی بقولِ شاعر:

زندگی کیا ہے، عناصر میں ظہورِ ترتیب موت کیا ہے، اسی ترتیب کا بگڑ جانا۔

اور:

اول وآخر فنا، باطن و ظاہر فنا نقشِ کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا

اسی لیے اس مکتب فکر کے مطابق کائنات کی حقیقت بھی مادے کے سوا کچھ نہیں جو کہ بنا کسی مقصد یا منصوبے کے اپنا وجود رکھتا ہے۔زندگی طبیعی انتخاب (یعنی natural selection) کے نتیجے میں، اور کامل ترین کی بقاء (یعنی survival of the fittest) کے اصول کے تحت ارتقاء پاتی ہے۔ اس سوچ کا فطری نتیجہ یہ نکلا ہے کہ انسان کے بلند تصوراتی پیکر (ideals) کوئی معنی نہیں رکھتے سوائے اس کے کہ انسانی زندگی کے حیوانی پہلو کو برقرار رکھا جائے اور حیوانی نوعیت کے تقاضے اور وظائف ادا کیے جاتے رہیں۔ کیونکہ یہ مکتبِ فکر تخلیق کو، اور اس کے قرنہا قرن سے بتدریج بلند ہوتے ہوئے مدارج کو، تسلیم نہیں کرتا اس لیے لامحالہ خالق کے وجود سے بھی انکاری ہے (Atheism)۔ اسی نظریاتی اساس پر وہ حیاتِ آخرت کے وجود سے بھی متفق نہیں، یا اس کے بارے میں شک وشبہ کا شکار ہے (Agnosticism)۔

لیکن قارئین، اس نظریے کی بنیادیں خود سائنس کی ترقی نے ہلا کر رکھ دیں۔ بیسویں صدی کے ظہور کے ساتھ ہی مادے کا تصور ایک جوہری تبدیلی کا ہدف بن گیا۔ سائینسدانوں نے یہ قبول کیا کہ مادے کی حقیقت دراصل بجز توانائی [energy] کچھ اور نہیں ہے اور مادہ دراصل ایک ٹھوس بہروپ ہے جو توانائی نے اختیار کر لیا ہے۔ مزید برآں، مادہ اس لیے بھی توانائی ہے کہ انسانی وجود سمیت اس کائنات کا ہر ذرہ مسلسل حرکت [motion] پذیر ہے، اور جہاں حرکت ہو وہاں توانائی کا ہونا لازمی ہے۔ اب یہ سوال کہ آیا اس کائنات کی حقیقت صرف مادہ ہے یا صرف توانائی، یا پھر ایک انتہائے شعور، یا ایک عظیم شعوری ذات، تو اس کے جواب کیلیے ہمیں ابتدا پھر اس سوال سے کرنی پڑے گی کہ یہ کائنات اپنی مکمل شکل میں کیسے عالمِ وجود میں داخل ہوئی۔

البتہ توانائی کی دریافت کے روزِ اول ہی سے یہ حقیقت تسلیم کرنی لازم ہوگئی کہ مادیت پرستوں کا انسانی زندگی کے بارے میں خالص مادی ٹھہرائے جانے کا نظریہ بہرحال باطل ہے۔تو اب مادیت کی بحث کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانے کیلیے ہمیں

چند نکات پر سیر حاصل تبصرے کی ضرورت پڑے گی، جن میں سے ایک نکتہ تو یہ ہے کہ اگر مادہ دراصل توانائی ہے تو پھر توانائی کیا ہے؟ سائنس اس ضمن میں ہاتھ پاؤں مارنے میں مصروف ہے اور "مستحکم انرجی"[stable energy]اور "بلیک انرجی" [black energy] کی قسم کی اصطلاحات ایجاد کی جا رہی ہیں جو توانائی کی یا کائنات کی حقیقت ٹھہرائی جا سکیں۔ خاص طور پر انسانی حیات کے ضمن میں مادے اور توانائی کی بحث ہمیں کس فیصلہ تک پہنچاتی ہے۔ لامحالہ ہمیں حیاتِ آخرت کے ضمن میں ان سوالات کو زیرِ بحث لانا ہوگا کہ زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اسے پیدا کرنے والا کون ہے؟ آیا کہ اس کائنات کے وجود کے ماوراء کوئی زندہ وجود ہے جس نے مزید ذیلی زندگی پیدا کی؟ جب زندگی نے کئی سابقہ مراحل کے بعد انسانی پیکر اختیار کیا تو وہ کن اجزاء سے تشکیل پائی اور وہ اپنی ہیئتِ ترکیبی میں کس طرح حیات کی دیگر اشکال سے مختلف ہے؟ نیز موت کا سرِّ نہاں کیا ہے؟ یہ کائنات کیوں وجود میں آئی؟ کیا تمام تخلیقی عمل میکینیکل اور خود کار ہے یا کسی مربوط پلان پر مرحلہ وار عمل درآمد کا نتیجہ ہے؟

اس کے برخلاف دوسرا مکتبِ فکر ہے جو صحائف کا پیروکار ہے اور صحائف کی تعلیمات کے مطابق کائنات کو ایک تخلیق کے طور پر مانتا ہے۔ تخلیق کے پیچھے ایک خالق کے عظیم وجود کو تسلیم کرتا ہے جس نے انسان کو اپنی فطرت پر یعنی اپنی صفاتِ عالی سے آراستہ فرما کر پیدا کیا۔ [**فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا ۔۳۰/۳۰**] ۔اقبال کی شعری تشریح نے اس امر کی یوں تصدیق فرمائی:

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات   ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

آخری مکمل ترین صحیفے، قرآن کے مطابق موت و حیات کا دائرہ اس لیے تخلیق کیا گیا کہ انسان کو حسین تر اعمال کے ذریعے اس کی ذات کی نشو و نما کے مواقع فراہم کیے جائیں [**الذی خلق الموت و الحیات لیبلوکم أیکم احسن عملا**۔ آیت ۲/۶۷]۔اقبال کا یہ شعر غالباً اسی آیتِ مبارکہ کی تفسیر میں کہا گیا:

یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار   کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

اسے ایک بہتر طرزِ زندگی گزارنے کے لیے انبیاء کے ذریعے دائمی ضابطہ کردار عطا کیا گیا [**ذلک الکتاب لا ریبَ فیہ ھدی للمتقین** . آیت ۲/۲] ۔

انسانوں کی تمام انواع کو، بلا لحاظ چھوٹا یا بڑا، کمزور اور طاقتور، تہذیب یافتہ یا غیر مہذب، الہامی ضابطۂ کردار کی اطاعت کا مکلّف قرار دیا۔[**ما خلقتُ الجنّ و الانس اِلّا لیعبدون . ۵۱/۵۶**].

کائنات کی تخلیق کا یہ مقصد متعین کیا گیا کہ انسانوں سمیت ہر زندہ مخلوق کو اس کی محنتوں اور کاوشوں کا پورا پورا اور جائز اجر مل سکے اور ان میں سے کسی کی حق تلفی نہ ہونے پائے [**خلق اللہ السموات و الارض باالحق و لتجزیٰ کل نفس بما**

كسبت، و هم لا يظلمون. آیت ۴۵/۲۲] ۔ یعنی یہ صریحاً واضح کیا گیا کہ کائنات اپنے وجود میں کوئی علیحدہ اور خود مختار تخلیق نہیں بلکہ تخلیق کیا ایک مربوط سلسلے سے جڑی ہے اور بلند ترین مرحلے پر موجود انسان کی ضروریات اور مقاصد کو پورا کرنے میں بنیادی کردار ادا کر رہی ہے۔

اسے آزادی اور بہترین صفات عطا کی گئیں [لقد خلقنا الانسان فی احسنِ تقویم۔آیت ۹۵/۴] تا کہ وہ خالق کے انسانیت کی فلاح کے مقاصد کے لیے کام کر سکے اور اس دنیا کو جنتِ ارضی میں تبدیل کر دے جہاں دکھ، افلاس، ظلم اور احتیاج باقی نہ رہے۔

تمام اعمالِ حسنہ کے اجر کے طور پر اسکو ہمیشگی کی زندگی اور برتر درجہ میں منتقلی کا وعدہ فرمایا گیا۔ الہامی ہدایت کی خلاف ورزی میں زندگی گذارنے والوں کو اسی اگلے درجہِ حیات میں سزا کا مستوجب قرار دیا گیا۔[بحوالہ متعدد آیات]۔
یہ بھی واضح فرما دیا گیا کہ یہ دنیاوی زندگی دراصل ایک امتحان گاہ ہے جس میں پیش کی گئی کارکردگی کا نتیجہ حیات آخرت میں روبہ عمل ہوگا۔

انسان کی موجودہ زندگی مادے اور روح کا ایک باکمال امتزاج ہے۔وہ فنا نہیں ہوتا بلکہ مادے کی آلائشوں سے پاک ہو کر ایک نئے مرحلہِ زندگی میں داخل ہوتا ہے۔ یہ مرحلہ ایک بلند تر اور ارفع و اعلیٰ سطحِ زندگی ہے جہاں پہنچ کر وہ اپنے خالق کے آئیڈیل کے روپ میں ڈھل جائے گا، اور خالق کے پلان کے تحت اپنی منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں ہو جائیگا۔

گویا کہ حیاتِ آخرت ایک مربوط اور باہم متحد تخلیقی منصوبے کا آخری یا انتہائی مرحلہ ہے اور اس لحاظ سے اہم ترین حیثیت کا حامل۔ تو آیئے تحقیق کا آغاز کرتے ہیں۔

حیاتِ آخرت کی تعریف

آیئے قارئین، سائنسی تحقیق کا دورانیہ مقابلتاً طویل ہونے کی بناء پر اسے بعد کے ابواب تک مؤخر کرتے ہوئے، اولاً، دوسرے بیان کردہ نظریے کے اتباع میں، قرآن کے حوالے سے بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

حیاتِ آخرت :

قرآن میں آخرت کے ساتھ حیات کا لفظ شاذ ہی ستعمال ہوا ہے کیونکہ صرف لفظ [الآخرۃ] ہی کے معنوں میں مکمل اصطلاح [حیاتِ آخرت] موجود ہے۔ ثبوت کے لیے نیچے [لین کی لغت] سے حوالہ دیکھیے۔

حیات:

حیات کے بارے میں تو ہم سبھی جانتے ہیں کہ زندگی کا عربی مترادف ہے۔اس کا مادہ حیی ہے۔نستعلیق اردو زبان میں، یعنی اردوئے معلّٰی میں بھی زندگی کو حیات ہی کہا جاتا ہے۔ حیاتِ مستعار، حیاتِ نو اور حیات آفرینی اردو زبان کے ہی ادبی استعارے ہیں اور نثر و شاعری میں کثرت سے مستعمل۔

آخرت:

اس لفظ کا مادہ اَ خ رَ ہے جس کے بنیادی معانی کچھ اس طرح ہیں:

واپس پلٹنا، پسپائی / پیچھے ہٹنا / ریٹائر ہونا / پیچھے رک جانا / موخر کر دینا / التوا میں ڈال دینا، کسی چیز کا فائنل یا آخری جزو، ایک اور، دوسری یا ثانوی چیز۔

چند مشتقات درج ذیل ہیں:

۱) آخَرُ (Aakharu): ایک اور، یا دوسرا

۲) آخران (Aakharaan): دوسرے دو

۳) آخَرین (Aakharain - acc.)

۴) آخِرِین(Akhiriin - acc.)

۵) آخرون(Akhruun - nom.n.plu.): دوسرے

۶) اُخریٰ (Ukhraa - n.f.): ایک اور

۷) اُخَرُ (Ukharu - n.plu.f.)

۸) آخِرُ(Aakhiru - n.): آخری؛ فائنل؛ وہ جسے بعد میں آنا ہے؛ بعدازاں

۹) آخِرَۃٌ (Aakhiratun): آخری؛ بعد میں آنیوالا؛ حیاتِ آخرت؛ اگلی یا آئندہ زندگی

آخری تحریر کردہ مشتق، یعنی نمبر۹) ہی ہمارا مطلوب و مقصود ہے کیونکہ یہی ہمارے زیرِ تحقیق موضوع یعنی [حیاتِ آخرت] سے متعلق ہے۔ یہاں واضح ہو کہ لفظ آخرت، جیسا کہ ماقبل میں اشارہ دیا گیا، اپنے تئیں خود ہی ''حیاتِ آخرت'' کی تعریف میں آتا ہے۔یعنی ''آئندہ مرحلۂ زندگی'' ۔یعنی اگر ہم حیات اور آخرت کو موصوف اور صفت کے مرکب کے طور پر نہ بھی لکھیں، بلکہ صرف ''آخرت'' ہی کی اصطلاح تنہا استعمال کریں تب بھی ہمارے عنوان کی مکمل ترجمانی ہو جاتی ہے۔ اور اگر ہمارا عنوان صرف ''تحقیقِ آخرت'' ہوتا، تب بھی مکمل اور خود مکتفی تھا۔اس لیے کہ خود قرآن میں حیاتِ آخرت کے لیے صرف ''الآخرۃ'' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔قرآن میں یہ اصطلاح اس کے پورے طول میں کوئی ۱۲۷ بار دہرائی گئی ہے جس سے اس کی انتہائی اہمیت ظاہر ہے۔ الآخرۃ کے بالعکس، تقابلِ ضدین کے اصول کے تحت، اس لفظ کے ساتھ اکثر مقامات پر، کوئی ۶۱ مرتبہ، قرآنی اصطلاح ''حیات الدنیا'' پیش کی گئی ہے، تاکہ ''الآخرۃ'' کے مفہوم کو درست طور پر جاننے کے لیے کسی غلطی کا امکان باقی نہ رہے۔

تحقیقِ آخرت، از روئے قرآن

احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسر   تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پازند

قارئین، آپ سوچیں گے کہ قرآن تو دیگر صحائف کی مانند آخرت کا بھرپور پرچار فرماتا ہے، اور جزا و سزا کا قرآنی فلسفہ بیش تر تصورِ آخرت پر ہی مبنی ہے، اس لیے یہاں تحقیق کے گھوڑے دوڑانا کیا معنی رکھتا ہے؟

تاہم بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ قرآن کو بھی مخصوص تراجم وضع کرنے کے حربے کے ذریعے آخرت کے انکار کے لیے تختۂ مشق بنایا گیا اور استحصالی انداز میں استعمال کر لیا گیا ہے۔ لہٰذا قرآن سے آخرت کی تحقیق کرتے ہوئے اگر اس میدان میں موجود مخالفانہ مواد کو زیرِ بحث نہ لایا جائے تو ہمارا موضوع نامکمل رہ جانے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔ نیز جانبداری کا الزام بھی صادق آ سکتا ہے۔

جہاں تک آخرت کی زندگی کی نوعیت سے متعلق مختلف نظریات کا معاملہ ہے، یعنی اُس زندگی کی شکل و صورت اور ماہیت کا سوال ہے، تو یہ ہمارے مقالے کا موضوع نہیں ہے۔ اس معاملے میں عموماً صرف اندازے لگائے جاتے ہیں اور قیاسات سے کام لیا جاتا ہے جن میں غالب عنصر دیومالائی کہانیوں سے اپنے ماخذات لیتا ہے۔ اس ناچیز کے مطالعے کے مطابق نچلی سطحِ شعور پر زندگی گزارنے والی کوئی بھی مخلوق خود سے بلند تر سطح کے بارے میں ادراک حاصل کرنے کے نااہل ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ایک چوتھی جماعت کا طالبعلم پانچویں جماعت کے کورس سے اور اس کے فہم سے لاعلم رہتا ہے۔ یا ایک اسکول کا طالبعلم، یونیورسٹی کی سطح کے علم و فہم سے نابلد رہتا ہے۔ یا بالکل ایسے جیسے سابقہ حیوانی مرحلۂ حیات اپنی کم تر شعوری اقدار کے باعث اپنے بعد آنے والے بلند تر مرحلۂ انسانی کی زندگی کی ماہیت اور سرگرمیوں کے بارے میں کچھ جاننے سے قاصر ہے۔ آخرت بھی انسان کی موجودہ سطحِ شعور سے بلند تر سطح ہے۔ لہٰذا انسان اُس بلند تر سطح کی شعوری اقدار سے لاعلم رہنے پر مجبور ہے۔ البتہ اس زندگی کی نوعیت کی کچھ جھلکیاں تشبیہات کے وسیلے سے تجریدی انداز میں اور علامتی اسلوب میں صحائف میں بیان کر دی گئی ہیں۔

اولاً اس موضوع پر آخرت کے وجود کے مخالف دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان دلائل کا تجزیہ، سندات کے ساتھ ان کا مؤثر ابطال، اور بعد ازاں آخرت کے حق میں ان قرآنی نصوص کی تفصیل اور مستند ترجمہ جن سے انکار کی کوئی سبیل نہیں بن سکتی۔ ماسوائے اس کے کہ قرآن اور اس سے ماقبل آنے والے تمام صحیفوں کو الہامی ہدایت ماننے سے ہی انکار کر دیا جائے۔

قرآن کے ماننے والوں میں، بالکل اسی طرح جیسے دوسرے آسمانی صحیفوں پر یقین رکھنے والوں میں، اب تک بلا استثناء حیاتِ آخرت یا حیات بعد از جسمانی موت کا تصور ایک یقینی کیفیت کے ساتھ پایا جاتا رہا ہے۔ اب تک حیاتِ آخرت کی جو بھی مخالفت

سامنے آئی تھی وہ غیر مذہبی عناصر کی جانب سے تھی جو الہامی صحائف پر یقین وایمان سے عاری تھے۔ اسی لیے مقامِ حیرت ہے کہ حالیہ برسوں میں القرآن کے تراجم کے ذریعے حیاتِ آخرت کا انکار کرنیوالا ایک پہلا گروہ پاکستان کے شہر لاہور میں نمودار ہوا ہے جس کا دعویٰ ہے کہ قرآن کسی حیات بعد الموت یا آخرت کی زندگی کا ذکر نہیں کرتا، بلکہ آخرت سے اس کی مراد اسی دنیا میں اسی زندگی کا کوئی آنیوالا بہتر اور اعلیٰ دور ہے۔ایک ایسا دور جہاں قرآنی نظامِ حیات کی مکمل پیروی نافذ کردی جائے گی۔

اس جماعت کے دعووں کے مطابق اسی دنیا میں مستبد قوتوں کو شکست دے کر قرآنی معاشرے کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے اور تمام انسانی حقوق میسر کردیے جاتے ہیں اور امن اور شانتی کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔اور یہی مرحلہ الساعۃ ،آخرت، قیامت، وغیرہ ہے۔ یعنی یہ گروہ آخرت کے تناظر میں صرف خوشگواریاں ہی تصور میں لاتا ہے، اگرچہ اسی دنیا کی مادی زندگی کے حوالے سے۔

الحیات الدنیا کی قرآنی اصطلاح کا ترجمہ یہ گروہ ''کم تر یا پست سطح کی زندگی'' قرار دیتا ہے، یعنی الحیات الدنیا کی ترکیب کو قطعاً غیر مستند اور بلا اختیار انداز میں توڑ موڑ کر الحیات الادنیٰ کے مترادف ٹھہرا دیتا ہے تا کہ اس تبدیلی سے اس کے وضع کردہ آخرت کے خصوصی معنی میں، تقابلِ ضدین کے اصول کی رُو سے، کچھ وزن پیدا ہو جائے۔ یعنی بہتر اور اعلیٰ کے تقابل میں کم تر یا پست دکھایا جاسکے۔یعنی ایک خیالی تقابل اس لیے گھڑنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک ماقبل وضع کیے گئے ندرتِ خیال کے حق میں راہ ہموار کی جائے یا اسکی کمزور بنیادوں کو سہارا فراہم کیا جائے۔

اس گروہ کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ محمد ﷺ کسی حقیقت، شخص اور وجود کا نام نہیں۔ اس اسم سے موسوم کوئی مخصوص شخصیت پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ یہ ایک مجہول صفاتی سانچے کا یا ایک تصوراتی کردار کا نام بلکہ لقب ہے جسے بعض ذہین اور طباع لوگوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے گھڑ لیا ہے۔قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام یعنی وحی نہیں۔ یہ کتاب کسی ذہین و فطین شخص کی مرتب کردہ ہے اور یہ عہدِ وسطیٰ کی سماجی اور سیاسی کشمکش میں حقوقِ انسانی کے حصول یا پرچار کے لیے لکھی گئی ہے۔اس گروہ کا اپنا ویب سائٹ موجود ہے جہاں سے درجِ بالا حقائق کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔

تمام آثار و شواہد اشارہ دیتے ہیں کہ گزشتہ دو صدیوں کے دوران خارجی محاذ پر دین اللہ کے انہدام کے لیے جو نیا سنگین بحران پیدا کیا جارہا ہے، اور جس کا ایجنڈا ان ہی مذکورہ نکات پر مشتمل ہے جو اوپر بیان کیے گئے ہیں، اس کے ضمن میں دین دشمن [گلوبل الومیناٹی] کے کار پردازوں کو مسلم کمیونٹی کے اندر سے جو شریک کار میسر آ گئے ہیں ان میں لاہور کا یہ گروہ بھی شامل ہے۔ ان کے زیرِ ترویج ایجنڈے کے مطابق اسلام کسی آسمانی اور ربانی اِلقاء کا نتیجہ نہیں، یا کوئی آسمانی دین نہیں ہے، بلکہ خطۂ عرب کی مخصوص سیاسی، معاشرتی اور معاشی صورتِ حال اور تناظر میں ایک ذہین اور صاحبِ عزم شخص ''محمد''، جو دراصل نام نہیں بلکہ ''تعریف کے لائق'' صفات رکھتا تھا، کے عزائم اور ان کے نتیجے میں قائم ہونے والی تبدیلیوں کا نام ہے۔

قارئین، آخرت سے انکار ایک آسان مہم ہرگز نہیں ہے۔ جس طرح مثل مشہور ہے کہ ایک جھوٹ چھپانے کے لیے دس جھوٹ بولنے پڑتے ہیں، بعینہ ایک آخرت کا انکار انسان کو خود کار انداز میں مزید تکفیر کی طرف بھی کھینچ لیتا ہے۔ لفظ تکفیر سے کسی غلط فہمی کا شکار مت ہو جائیں۔ یہ صرف انکار کے معنوں میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ فتوے بازی ہرگز اس عاجز کا شعار نہیں، کیونکہ اس ناچیز کے خیال میں اپنے ایمان کا قطعی فیصلہ ہر انسان خود ہی کیا کرتا ہے۔ تو اس تکفیرِ آخرت میں انسان کے لیے یہ بھی ضروری ٹھہرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا بھی انکار کیا جائے، پھر نبوت و رسالت کا بھی انکار کیا جائے اور موت کے لیے بھی کوئی نیا نظریہ گھڑا جائے۔ پس اپنے نظریہ کو تقویت دینے کے لیے یہ چھوٹا سا گروہ بھی اللہ کے وجود سے انکار کرتا اور اپنے تراجم میں اللہ کی ذات کو اسلامی یا قرآنی حکومت کے مترادف تعبیر کرتا ہے۔ اور اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے، یہ گروہ "موت" کا بھی ہر مقام پر استعاراتی ترجمہ کرتا ہے جس کی رُو سے موت کو ہر مقام پر "اسی دنیا میں قوموں کے زوال" کے معنوں میں لیتا ہے۔ اسی مفہوم کے اتباع میں، حیاتِ آخرت یا بعثت، قرآن کے ہر مقام پر اور ہر سیاق و سباق میں، قوموں کے ازسرِ نو بیدار ہو کر ترقی کر جانے کے عمل کو کہا جاتا ہے۔ اور یہ بھی اس کا اعلانیہ موقف ہے کہ جسمانی موت کا قرآن میں ذکر نہیں کیا گیا، لہٰذا سزا و جزا، مکافاتِ عمل، جنت و جہنم کی تعبیر اسی دنیا میں اسی جسمانی زندگی میں سامنے آتی ہے۔

یہ گروہ اپنے نظریہ کے حق میں آیت ۲/ ۲۸ پیش کرتے ہوئے کچھ اس طرز پر استدلال کرتا ہے:۔

كيف تكفرونَ باالله و كنتم امو اتاً فاحيا كم، ثمّ يميتكُم، ثم يحييكم، ثم اليه ترجعون:

تم اللہ کا کیسے انکار کر سکتے ہو، یہ دیکھتے ہوئے کہ تم مردہ تھے، اس نے تمہیں زندگی دی۔ پھر وہ تمہیں موت دے گا اور پھر دوبارہ زندگی کی طرف لائے گا [بعثت کے دن] پھر تم اسی کی طرف لوٹو گے۔ [عمومی ترجمہ]۔

"یہ آیت واضح طور پر کہتی ہے: ۱) ہم مردہ تھے ۲) اس نے ہمیں زندگی دی ۳) وہ ہمیں دوبارہ مار دے گا ۴) پھر وہ ہمیں دوبارہ زندہ کر دے گا ۵) پھر ہم اس کی طرف لوٹ جائیں گے۔۔۔۔۔ دوسرے اور تیسرے مرحلے کے علاوہ باقی نہ تو کسی شماریاتی گواہی اور نہ ہی مشاہدے سے ثابت کیے جا سکتے ہیں اور نہ ہی ماضی کے علم سے۔ کچھ لوگوں کے لیے تو دوسرا اور تیسرا مرحلہ بھی متنازعہ ہے۔ اگر ہم نے اندھا ایمان رکھنا ہے تو اس تمام مشکل بحث کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر ہمیں جزوی طور پر کوئی اندھا عقیدہ رکھنا ہے تو پھر کلی طور پر کیوں نہ رکھیں۔ ہم متفق ہیں کہ ہم کسی ایسے [انسان] کو نہیں جانتے جو مرنے کے بعد واپس آ گیا ہو اور ہمیں حیات بعد الممات کے وجود سے متعلق کوئی ثبوت دے سکے۔ اور ہمیں ہر چیز سے زیادہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ قرآن ایسی چیزوں کے متعلق بات نہیں کرتا جو ثابت نہ کی جا سکیں یا ہمارے شعور اور فہم سے بالا ہوں"۔

قارئین، ملاحظہ فرمایا آپ نے درجِ بالا طرزِ استدلال!

اسی مادہ پرستانہ ایجنڈے کے تحت یہ گروہ حیاتِ آخرت پر یقین نہیں رکھتا۔ اب دیکھیے کہ زیرِ بحث آیت کا ان کا اپنا وضع کردہ مخصوص ترجمہ کس نوعیت کا ہے:

آیت ۲/۲۸: کیونکر تم قوانینِ قدرت کا انکار کر سکتے ہو جب کہ تم محکوم تھے تو تم کو آزادی دی، مزید یہ کہ تم محکوم بھی ہوتے ہو اور آزاد بھی رہو گے اور اسی کے قوانین کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

آیئے اب اس ترجمے کا تجزیہ کر لیتے ہیں۔

۱۔ اللہ کی ذاتِ خالق سے انکار کے لیے [قوانینِ قدرت] کی اختراع استعمال کی گئی۔

۲۔ [مزید یہ کہ تم محکوم بھی ہوتے ہو اور آزاد بھی رہو گے]؟؟؟

کیا یہ [ثم یمیتکم ثم یحییکم] کا درست ترجمہ ہے؟ اگر ہے تو بتایا جائے کہ گرائمر کے کس اصول کے تحت فاعل کو غائب کر دیا گیا ہے؟ اور فقرے کی ساخت کو "کرنے" کی بجائے "ہونے" میں کیوں تبدیل کر دیا گیا؟ کیا واقعی فاعل، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کو درمیان سے نکالنے کے لیے فاعل کا صیغہ غائب نہیں کیا گیا؟

یہاں تو کہا یہ جا رہا ہے کہ "اس کے بعد وہ [اللہ]، یا اس کا مقرر کردہ طبیعی قانون، تمہیں موت دے دیتا ہے، یا دے دے گا (فعلِ مضارع)، اور اس کے بعد پھر وہ تمہیں زندگی دے دیتا ہے، یا دے دیگا"۔ صاف ظاہر ہے کہ اس گروہ کے وضع کردہ موت وزندگی کے تراجم [یعنی محکومی اور آزادی] آیت کے اس حصے پر لاگو نہیں ہو سکتے تھے، اور لاگو کرنے سے ان کا ذاتی ترجمہ بالکل مہمل ہو جاتا، فلہٰذا آیت کے اس حصے کے متن کی ترکیب ہی بدل ڈالی گئی اور خود ساختہ ترجمہ کر دیا گیا۔ وہ اہم سوال جس کا جواب نہیں دیا گیا یہ ہے کہ

۳۔ کیا اللہ تعالیٰ بار بار اقوامِ عالم کو محکومی اور آزادی دیتا رہتا ہے؟

۴۔ یا صرف دو، دو بار ضرور اس طرح کا عمل کرتا ہے؟

کوئی ثبوت، یا تاریخ سے کوئی مثال؟ یقیناً کوئی بھی نہیں۔

۵۔ کیونکہ کتنی ہی قومیں ایسی گزری ہیں جو ایک بار زوال کے بعد ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے معدوم ہو چکی ہیں۔ یا ہمیشہ کے لیے قعرِ مذلت کی نذر ہو چکی ہیں۔ لہذا یہاں استعاراتی مفہوم کی بجائے موت کو موت اور زندگی کو زندگی ہی ماننا پڑے گا اور دوسری مرتبہ کی زندگی کو حیاتِ آخرت ہی ماننا پڑیگا تبھی جملے میں کوئی شعور کا عنصر پیدا ہوگا۔

یہاں ایک اور فرمان الٰہی بھی نقل کرنے کی اجازت چاہوں گا جو قطعی فیصلہ کن نوعیت کا حامل ہے:

آیات:۵۳/ ۲۷۔۳۰: **انّ الذین لا یومنونَ بالآخرۃ لیسمّون الملائکۃ تسمیۃ الأنثیٰ . و ما لھُم بہ من علم. ان یّتبعونَ الّا الظن و ان الظنّ لا یغنی من الحق شیئاً. فاعرض عن من تولیٰ عن ذکرنا و لم یرد الّا الحیاۃ الدنیا .**

ترجمہ: وہ لوگ جو حیاتِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ضرور ملائکہ کو مؤنث صنف کے نام سے موسوم کرینگے۔ دراصل وہ بے علم ہیں۔ وہ صرف قیاس کی پیروی کرتے ہیں، جب کہ قیاس حقیقت کے تناظر میں بے سود ہوتا ہے۔ پس اعراض برتو ان سے جو ہماری نصیحتوں سے منہ موڑ لیتے ہیں اور صرف اسی دنیاوی زندگی کو مقصود سمجھتے ہیں۔ ان کا مبلغ علم بس اتنا سا ہی ہے۔

قارئین، یہ ہے ایک قطعی حسب حال اور خود مکتفی ارشادِ ربانی، جس سے واضح ہوا کہ:

- آخرت پر ایمان نہ رکھنے والے بے علم ہیں۔
- وہ قیاس پر چلتے ہیں۔
- وہ اللہ تعالیٰ کی نصیحت/ کلام سے منہ موڑتے ہیں۔
- اسی دنیاوی زندگی کو مقصود سمجھتے ہیں۔
- ان کا مبلغ علم کچھ بھی نہیں۔

معزز قارئین، کیا واقعی، بقول اس گروہ، یہ تمام حتمی الٰہی فیصلے صرف ان لوگوں کے خلاف ہیں جو مستقبل قریب میں، اسی دنیا اور اسی زندگی میں، وقوع پذیر ہونے والی کسی تبدیلی کے بارے میں پر یقین نہیں ہیں؟

کیا سب لوگ جن سے یہ سب کچھ کہا جا رہا ہے، واقعی اتنی طویل زندگی کی گارنٹی رکھتے ہیں کہ کوئی آنے والی تبدیلی دیکھ سکیں؟ جو انسان ساٹھ سے اسی پچاسی سال کی عمر میں مر جاتا ہے، اسے کسی سینکڑوں سال بعد اسی دنیا میں آنے والی تبدیلی کے بارے میں خوش گمانی میں کیسے رکھا جا سکتا ہے؟

سب جانتے ہیں کہ قوموں کے حالات میں تبدیلیاں ایک طویل المدت عمل ہوتا ہے جو صدیوں اور ہزاریوں کے بعد روبہ عمل آتا ہے، وہ بھی اُس صورت میں اگر حالات کسی وجہ سے موافق ہو جائیں۔ جبکہ یہاں تو اس دورانیے میں گزر جانے والے ہر انسان کو انفرادی طور پر آخرت پر یقین کا مکلّف قرار دیا جا رہا ہے۔ کیسے؟

کیا لازمی طور پر یہ کوئی ایسی آخرت نہیں ہے جس کا سامنا ہر انسان کو کرنا ہے؟

اسی دنیا میں اسی زندگی میں آنیوالی کوئی تبدیلی تو سب نہیں، صرف اُس موقع پر زندہ پائے جانے والے انسان ہی دیکھ سکیں گے یا نہیں؟

یا پھر واضح طور پر یہ زندگی کے اگلے مرحلے میں بلا استثناء تمام انسانوں کے لیے یکساں منتقلی کا بیان ہے؟
امید ہے کہ اس بحث کے نتیجے میں قارئین خود ہی آسانی سے فیصلے تک پہنچ سکتے ہیں۔

معزز قارئین، قرآن کے متن کی دست برد کے ذریعے حیاتِ آخرت کے انکار کی اب تک اس احقر کے ناقص علم کے مطابق یہی ایک کوشش منظرِ عام پر آئی ہے۔ تو آیئے اس مخالف نظریے کی چھان پھٹک کرنے کے بعد اب قرآنی نصوص کے ذریعے حیاتِ آخرت کی موافقت میں ثبوت دے دیے جائیں۔

آخرت کے لفظ سے متعلق اتنی زیادہ تعداد میں آیات موجود ہیں کہ مقالہ نہایت طویل ہو جانیکا خوف ہے۔ اس لیے آیئے، پہلے مرحلہ میں صرف وہ مقامات دیکھ لیتے ہیں جہاں آخرت کو بمقابلہ حیاۃ الدنیا لے کر اس کا اثبات کیا گیا ہے اور تقابلِ ضدین کا ناقابل تردید اسلوب استعمال کیا گیا ہے۔

آیت ۲/۸۶: أولٰئک الذین اشتروا الحیاۃ الدنیا بالآخرۃ، فلا یخفف عنھم العذاب و لا ھُم یُنصرون.

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے میں دنیاوی زندگی خرید لی ہے۔ پس ان پر آنے والا عذاب کم نہیں ہوگا اور نہ ہی ان کی مدد کی جائیگی۔

اگر ہم یہاں آخرت سے انکار کرنے والوں کی موقف کے مطابق یہ کہیں کہ:

''وہ جنہوں نے بعد میں [نہ جانے کس وقت آنے والی] اسی دنیا کی زندگی کے بدلے میں کمتر زندگی خرید لی ہے''۔۔۔تو کیا یہ قرین عقل ہوگا؟ یقیناً نہیں۔

اور قارئین، ''نہ ہی عذاب میں تخفیف کی جائیگی اور نہ ہی مدد کی جائے گی'' کا فرمان تب ہی قابلِ عمل ہوگا جب انسان مر کر مٹی میں نہیں مل جائیگا، بلکہ حیاتِ ابدی پا کر زندہ رہیگا؟ اگر مر کر مٹی میں ہی مل گیا، فنا ہو گیا، تو کیسا عذاب اور کیسی مدد؟

آیت ۲/۲۰۰: فمنَ الناسِ من یقول ربنا آتنا فی الدنیا، وما لہ فی الآخرۃ من خلاق.

ترجمہ: پس لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں ہمارے رب ہمیں اسی دنیا ہی میں نواز دے، لیکن ایسے شخص کے لیے آخرت میں حصہ نہیں ہوتا۔

کیا ہم یہاں کہ سکتے ہیں کہ آخرت میں حصہ کا مطلب کسی آنے والے زمانے میں اسی دنیا میں حصہ مراد ہے؟
کیا کسی شخص کی آنے والے کسی زمانے تک زندہ رہنے کی کوئی گارنٹی ہے؟
کیا کسی طرح بھی یہ راست ترجمہ حیاتِ آخرت کے معنی سے پرے ہٹا کر اسی دنیا کے کسی آنے والے دور پر منطبق کیا جا سکتا ہے؟
یقیناً نہیں۔

آیت ۱۱/۱۶-۱۵: مَن کانَ یرید الحیاۃ الدنیاو زینتھا، نوف الیھم اعمالھم فیھا و ھم فیھا لا

یبخسون،،اولٰئک الذینَ لیسَ لھم فی الآخرۃ الا النار، و حبط ما صنعوا فیھاو باطل ما کانو یعملون.

ترجمہ: جو دنیاوی زندگی اوراس کی زینتیں ہی چاہتے ہیں، ہم اس ضمن میں ان کی کاوشوں کی پوری ادائیگی کردیتے ہیں، اورانہیں محروم نہیں رکھا جاتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں سوائے آگ کے اور کچھ نہیں۔ جو کچھ اس میں انہوں نے بنایا تھا، ضائع ہوگیا اور جو کچھ عمل کیے وہ بے کار رہے۔

قارئین، کیا یہ اسی دنیا کی کسی بعد کے دور کی زندگی کا ذکر ہوسکتا ہے؟

یا جن لوگوں کو یہ کہا جارہا ہے، ان کی طویل زندگیوں کی کوئی ضمانت ہے؟

کیا وہ سب لامحالہ اس وقت تک جسمانی زندگی برقرار رکھیں گے جب تک آگ وغیرہ کی سزا ان پر نہیں آجاتی؟

جب اس زندگی میں کاوشوں کی پوری ادائیگی ہوگئی اور محروم نہیں رکھا گیا، تو وہ جن اعمال کے ضائع اور بیکار ہونے کا ذکر ہے وہ کس زندگی کا ہے؟

کیا یہ حضرات اس پیچیدگی کا کوئی شافی جواب دے سکیں گے؟

اگر زندگی صرف یہی جسمانی زندگی ہے تو یہاں الہامی متن میں ایک بڑا تضاد پایا جارہا ہے جسے حل کرنا ناممکنات میں سے ہوگا؟

ظاہر ہے کہ یہاں بھی سیدھا سیدھا حیات بعدالممات کا ہی ذکر ہے۔

آیت ۳/۱۴۵: و من یرد ثواب الدنیا، نؤتہ منھا و من یرد ثواب الآخرۃ نؤتہ منھا.

ترجمہ: جو اس دنیا کے ثواب کی خواہش کرتا ہے، ہم اسے اس میں سے دیدیتے ہیں، اور جو آخرت کے ثواب کی خواہش کرتا ہے ہم اسے اس میں سے دیدیتے ہیں۔

یہاں آخرت کیا ہے؟ کوئی یہیں آنے والا دور، یا آخرت کی زندگی؟

کسی سینکڑوں سال بعد آنے والے دور کا ثواب کسی کو اس مختصر زندگی میں کیسے مل جائیگا؟

اگر یہ اسی زندگی کا کوئی آنے والا دور ہوتا، تو ہم لاکھوں، کروڑوں انسانوں کو ایمانداری کی زندگی بسر کرتے اور بغیر کسی ''آخرت'' کے ثواب سے فیضیاب ہوتے، مرجاتے دیکھتے ہیں اور درج بالا آیت بے معنی ہوجاتی ہے۔ اس ارشادِ خداوندی سے تو حیاتِ آخرت کی موجودگی کے سوا کوئی اور معنی نہیں نکالا جاسکتا جہاں بیان کردہ ثواب سے متمتع ہوا جاسکے۔

آیت ۴/۷۷: قُل متاع الدنیا قلیل، والآخرۃ خیر لمن اتقیٰ، ولا تظلمون فتیلاً۔

ترجمہ: انہیں بتادے کہ اس دنیا کا مال واسباب قلیل ہے جبکہ آخرت ان کیلیے جو پرہیزگاری کرتے ہیں بہتر ہے، اوران کیساتھ کھجور کی گٹھلی کے دھاگے جتنا بھی ظلم نہیں کیا جائیگا۔

قارئین، درجِ بالا دونوں آیات میں دو مرکباتِ اضافی استعمال کیے گئے ہیں، ''متاع الدنیا'' اور ''ثواب الدنیا''۔

یہاں اگر مذکورہ حیاتِ آخرت کے مخالف گروہ کا واحد استدلال جو الحیات الدنیا کے معنی کی شکل میں ہے، منطبق کیا جائے، تو پوری عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔ یہاں دونوں مقامات پر دنیا مرکبِ اضافی کا جزء ہے اور واضح طور پر دنیا صفت نہیں بلکہ مقام کو بیان کرتی ہے۔
معنی متاع الدنیا، دنیا کی متاع اور ثواب الدنیا، اسی دنیا کا ثواب ہی ہو سکتا ہے، کیونکہ مقابلے میں پھر آخرۃ ہے۔

<u>آیت ۸/۶۷: تریدونَ عَرَضَ الدنیا و الله یُریدُ الآخرۃ، و الله عزیز حکیم.</u>

ترجمہ: تم دنیا کی فراوانی چاہتے ہو جبکہ اللہ آخرت کو پسند فرماتا ہے۔ اور اللہ غالب اور دانا ہے۔
یہاں [دنیا کی پیشکشیں] بمقابلہ [آخرت کی چاہتیں] کیا اسی دنیا اور اسی زندگی کے دورانیے کے دو علیحدہ اور یکے بعد دیگرے آنے والے دور ہو سکتے ہیں؟ اس مختصر زندگی میں کون ہے جو کسی آنے والے دور دراز دور میں خود کو زندہ پانے اور متمتع ہونے کی عبث امید رکھے گا؟
ہاں، البتہ حیاتِ آخرت کی شکل میں دائمی زندگی کا یقین ہو تو اس کی بہتری کے حصول کے لیے اس زندگی میں تمام ترحسین اعمال سرانجام دیے جا سکتے ہیں۔
غور فرمایئے تو کسی طرح بھی دنیا کے دور از کار ترجمے، یعنی ''گھٹیا اور کم تر'' کو یہاں منطبق نہیں کیا جا سکے گا۔ نہ ہی آخرت کے غیر عقلی ترجمے یعنی ''اسی دنیاوی زندگی کے کسی آنیوالے دور'' کی یہاں کوئی گنجائش نظر آئیگی۔

<u>آیت ۹/۳۸: أرضیتم بالحیاۃ الدنیا من الآخرۃ، فما متاع الحیاۃ الدنیا فی الآخرۃ الا قلیل.</u>

ترجمہ: تم آخرت کے مقابلے میں دنیاوی زندگی ہی کے حق میں رضامند ہوئے۔ تاہم دنیاوی زندگی کا مال و متاع آخرت کے موازنے میں قلیل ہے۔
کیا یہاں موجودہ کم ترسطحِ زندگی کو آئندہ آنے والے کسی موجودہ زندگی ہی کے بہتر دور سے تقابل کا موضوع بنایا جا رہا ہے یا کسی دیگر بلند تر سطحِ حیات کی یقین دہانی کرائی جا رہی ہے جو موجودہ حیات کے بعد ہی ممکن ہے؟
یا اگر مختصر دنیاوی زندگی کے بعد فنا ہی ہو جانا ہے، تو ''کسی اگلے دنیاوی دور'' میں کثرت کے وعدوں سے کسے بہلایا جا سکتا ہے؟
یہاں بھی <u>الآخرۃ</u> کے حقیقی معانی سے انحراف ممکن نہیں ہے۔

<u>آیت ۸۷/۱۶: بل تؤثرون الحیاۃ الدُنیا، والآخرۃ خیرٌ وابقیٰ۔</u>

ترجمہ: بلکہ تم تو دنیاوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، جبکہ آخرت کی زندگی بہتر اور زیادہ بقا رکھنے والی ہے۔
قارئین، اگر آخرت اسی دنیا کی کوئی آنے والی زندگی ہے، تو کیسے اس میں زیادہ ''بقا'' ہو سکتی ہے؟
زیادہ بقا تو جسمانی زندگی میں نہیں ہوتی بلکہ حیات بعد الممات ہی میں ہو سکتی ہے جہاں پہنچ کر انسان، مادی پیکر سے نجات پا کر ایک شعوری توانائی کی لطیف اور جاودانی شکل اختیار کر لیتا ہے، کیونکہ اس کی اصلِ حیات مادے سے ماوراء ہے۔

قارئینِ کرام، اس موضوع سے متعلق آیات اتنی زیادہ ہیں کہ اگلے دس بیس صفحات بھی ان کے بیان کے لیے کم رہیں گے۔ تاہم یہ ناچیز امید کرتا ہے کہ درجِ بالا مواد سے الہامی موقف اسناد کے ساتھ، عین الیقین سے دیکھ لیا گیا ہے۔ ان تمام آیات میں آخرت سے مراد دنیا ہی کا کوئی متوقع دور افتادہ جسمانی زندگی کا دور لیے جانے کے امکانات عقلِ سلیم کی بنیاد پر بھی ناپید ہیں جبکہ لغوی معانی کا تو ہم تجزیہ کر ہی چکے ہیں۔ یہاں دراصل حیات بعد الممات ہی کا ذکر ہے۔ چند دیگر آیات ملاحظہ فرمائیں:

آیت ۳۰/۴۰: __اللہ الذی خلقکم، ثم رزقکم، ثم یمیتکم، ثم یحییکم... ھل من شرکائکم من یفعل من ذلکم من شیئی . سبحانه و تعالیٰ عما یشرکون.__

ترجمہ: اللہ ہی وہ ہستی ہے جس نے تم سب کو تخلیق فرمایا ہے، پھر تمہیں سامانِ پرورش عطا فرمایا ہے، پھر بتدریج وہ تمہیں موت سے ہمکنار کرتا ہے اور __بعد ازاں پھر زندگی عطا فرماتا ہے۔__ کیا جنہیں تم اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو ان میں سے کوئی ایسا ہے جو مذکورہ کام تمہارے لیے کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔؟ وہ عظیم اور بہت بلند ہے ان باتوں سے جو وہ اس کی ذات سے منسوب کرتے ہیں۔

قارئین، یہاں __الآخرۃ__ کی اصطلاح استعمال کیے بغیر موت اور پھر، ایک اور زندگی، عطا کرنے کا نہایت واضح اور لفظی مفہوم پیش کیا گیا ہے۔ کیا یہاں بھی قرآنی تراجم کی دست برد کی طرف گستاخ ہاتھ اٹھانے والے اپنا خود ساختہ ترجمہ منطبق کر سکتے ہیں اور اس موت، اور بعد ازاں آنے والی زندگی کو، آج کی کمتر اور گھٹیا زندگی، اور کل کی آنے والی کوئی بہتر دنیاوی زندگی کے معانی میں تعبیر کر سکتے ہیں؟

افسوس کہ ایسا ہرگز ممکن معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ یہاں دیگر امور کا بھی لفظی معانی میں ہی، سلیس انداز میں، ذکر فرمایا گیا ہے۔ جیسا کہ تخلیق کا اور پھر سامانِ پرورش عطا فرمانے کا۔ پس یہاں بھی ہم کوشش کے باوجود حیات بعد الممات کے علاوہ کچھ اور باور نہیں کر سکتے۔

اور قارئین، اسی آیتِ مبارکہ کے تحت، لاہور کے اس گروہ کی ان کوششوں کا مؤثر ابطال بھی ہو جاتا ہے جو یہ لوگ اللہ کی مافوق الفطرت ذات کو اپنے جاری قرآنی تراجم میں ایک ٹھوس مادی صورت و ہیئت کی حامل اسلامی یا قرآنی حکومت کی شکل میں تعبیر و تعریف کے حربے کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہاں غیر مبہم اور سادے لفظی معانی کے انداز میں اللہ کی ذات کو خالق اور پروردگار کے اوصاف سے متصف فرمایا گیا ہے، جسے ایک اسلامی یا قرآنی حکومت سے تعبیر ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔

ایک سچی اسلامی یا قرآنی حکومت سامانِ پرورش مہیا کرنے کا فریضہ تو ضرور تسلیم کرتی اور ادا کرنے کی پابند ہوتی ہے لیکن زندگی کا خالق ہونے، سامانِ پرورش کی پیدائش کا نظام قائم کرنے، طبعی موت دینے، پھر موت کے بعد دوبارہ زندگی عطا کرنے کی صفات سے بہر حال عاری ہوتی ہے۔ یہ اختیار صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو اس کے تشکیل کردہ قوانین کے میڈیم سے حاصل ہے۔

قارئین، کیونکہ حیات بعد الممات کا عقیدہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے وجود کے اثبات سے ایک اٹوٹ رشتے سے جڑا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کے وجود کا اثبات بھی ہماری بحث کا ایک لازمی جزو ہے۔ اسی ضمن میں ایک اور آیتِ مبارکہ سے ایک فوق الفطرت خالق کے وجود کو ثابت کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

آیت مبارکہ ۲۹/۱۹: اَوَلَم یرَو کیفَ یُبدیُ اللہ الخلق، ثمّ یعیدُہُ۔

ترجمہ: کیا وہ لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ کس کمال سے تخلیق کے عمل کی ابتدا فرماتا ہے، اور اس کے بعد اس پیدائش کے عمل میں بار بار وقوع پذیر ہونے والا نسلی تسلسل قائم فرما دیتا ہے۔

یہاں اللہ کو قرآنی یا اسلامی حکومت سے تعبیر کر کے دیکھا جائے تو سراسر عقل و شعور کی توہین کا ارتکاب ہوتا ہے۔ یہ مانا کہ اکثر مقامات پر اللہ تعالیٰ کی ذات کو قانونِ قدرت سے تعبیر کر دیا جاتا ہے، اور یہ امر سراسر غلط بھی نہیں ہے۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے یہ یاد رکھا جائے کہ ہر قانونِ قدرت کے پیچھے وہی لافانی ذات موجود ہے جو انسان کی مانند شعور رکھتی، سوچتی، پلان کرتی اور پھر عمل درآمد کرتی ہے۔ حوالے کے لیے ملاحظہ فرمائیے آیتِ مبارکہ ۳/۵۴: و مَکَرُو و مکرَ اللہ، و اللہُ خَیر الماکرین۔ "اور انہوں نے پلاننگ کی، اور اللہ نے بھی پلان کیا، البتہ اللہ بہتر پلان کرنے والی ہستی ہے"۔

قانون یا قاعدہ، خواہ وہ تخلیق سے متعلق ہو، ایک شعوری سوچ [conscious thinking] کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ کسی حادثے کے نتیجے میں قاعدے اور قانون تشکیل نہیں پاتے، اور نہ ہی عظیم اور مربوط تنظیمی کارگاہیں وجود میں آتی ہیں۔ حوادث کے نتیجے میں صرف تباہی اور ابتری پیدا ہوتی ہے، نظم و ضبط اور قاعدے قانون نہیں۔ لہٰذا اگر کوئی انسان، خواہ کسی بھی قومیت سے متعلق ہو، یا کسی بھی بلند شعوری سطح کا حامل سمجھا جاتا ہو، اس محیر العقول درجے پر منظم و مربوط کائنات کو حادثے کا نتیجہ قرار دیتا ہے، تو اس کی ذہنی حالت بآسانی مشکوک قرار دی جا سکتی ہے۔ یا پھر یہاں، اس قسم کے کیسز میں، الہامی راہنمائی سے نفرت و انکار کی ایک انتقامی سائیکولوجی کارفرما ہوتی ہے۔

آخرت کی تطبیق انفرادی ذات کی بجائے نسلِ انسانی کے مجموعی سلسلے پر

قارئین، ایک سوال عموماً یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آیا آخرت کا تعلق آئندہ آنے والی نسلِ انسانی کی کسی ترقی یافتہ شاخ سے ہے یا یہ مسئلہ ہر انسان سے انفرادی طور پر متعلق ہے۔ بعض مفکرین اس موقف کے حامی ہیں کہ حیاتِ آخرت انفرادی انداز میں ہر انسان کے لیے تجویز نہیں کی گئی۔ اور یہ کہ ہم سب یہاں تفہیم کی غلطی کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ انعام تو نسلِ انسانی کی آئندہ آنے والی اُن پیڑھیوں کے لیے مقرر فرمایا گیا ہے جو ارتقائی عمل سے گزر کر بالآخر اُس درجہِ کمال تک پہنچ جائیں گی جہاں وہ کامل اتباعِ قرآنی کا مقصود حاصل کر

لیں گی۔ ہیشگی کا عنصر، اِس موقف کے حامیوں کے لیے، اُس انعام کے ضمن میں ہے جو اُس مرحلے پر پہنچنے کے بعد ہر آئندہ نسل کے نصیب میں لکھ دیا جائیگا۔ وہ انعام ہے: امن، سکون اور فراوانی کے دور کا قیام اور دوام۔ نہ کہ انسانی زندگی کا دوام۔ انفرادی طور پر تو انسان اسی طرز پر مر کر فنا کے گھاٹ اترتا رہیگا۔

یہ نظریہ بھی دو حقائق کی بنیاد پر باطل قرار دیا جاسکتا ہے۔

اولاً: آخرت کا تعلق اگر صرف بہتری اور انعامات سے ہی ہوتا تو یہ موقف مان لیا جاسکتا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آخرت تو جزا اور سزا دونوں پہلوؤں سے عبارت ہے۔ اُس زندگی میں جنت بھی ہے اور جہنم بھی۔ خوشگواریاں بھی ہیں اور عذاب بھی۔ مزید ارتقاء بھی ہے اور جہیم کی کیفیت بھی، جس میں زندگی دردناک محرومیوں اور پچھتاووں کا ایک ایسا سکوتِ مرگ ہوگی جو روح کو پیہم جھلساتا رہے اور انسان اُس ابدی مرحلہِ زندگی میں بھی ایک ایسی فنا خیز موت کی تمنا کرے جو میسر ہی نہ ہو۔ ملاحظہ فرمائیں الہامی ہدایت کے خزانے سے چار عدد حسبِ حال امور کا بیان جو درجِ بالا نکات کو شرحِ صدر کے ساتھ واضح کر دیتا ہے:

ا] ۶۴/۹: و من یومن باللہِ و یعمل صالحاً یکفر عنه سیئاته و یُدخلهُ جنّات تجری من تحتها الأنهار خالدین فیها أبداً...

اور جو بھی اللہ کے وجود پر یقین رکھتا ہے اور معاشرے میں تعمیری/اصلاحی کام سرانجام دیتا ہے، اس کی غلط کاریاں ڈھانپ دی جائیں گی اور اللہ اس کو ایسے باغات میں داخل فرمادے گا جن کیساتھ دریا بہتے ہوں گے، وہاں ایسے لوگ ہیشگی کی زندگی گزاریں گے۔

[یہ جزا اور خوشگواریوں کا بیان ہے]

۲] ۶۴/۱۰: و الذین کَفَرُوا و کَذّبو بآیاتنا أولٰئک أصحابُ النّارِ خالدینَ فیها..و بئس المصیر...

مگر وہ جو اللہ کے وجود سے منکر رہے اور ہماری آیات/نشانیوں کو جھٹلاتے رہے، یہی وہ آگ کے حقدار ہیں۔ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔

[یہ جہنم اور عذاب کا بیان ہے]

۳] ۷۸/۴۰: انّا انذرناکم عذاباً قریباً یومَ یَنظُرُ المرءُ ما قدّمَت یَدَاهُ و یقولُ الکافر یا لیتنی کنتُ تُرابا..

ہم نے تم سب کو مستقبل قریب میں آنے واے عذاب کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا جب انسان اپنے اعمال کا نتیجہ اپنے سامنے دیکھے گا، اور اُس وقت انکار کرنے والا کہیگا، اے کاش میں صرف مٹی ہوتا۔

[یہ اُس دائمی زندگی میں پچھتاووں اور محرومیوں کا بیان ہے]

۴] ۱۴/۱۷: یتجرّعُهُ و لا یکادُ یُسیغُهُ و یاتیهِ المَوتُ من کل مکانٍ و ما هُوَ بمَیّت...

وہ اس کے گھونٹ بھرے گا لیکن اسے حلق سے اتار نہیں پائے گا۔ جبکہ موت اس پر ہر جانب سے طاری رہے گی مگر وہ نہیں مرنے

پائے گا اور ایک بھاری عذاب اس پر مسلط رہے گا۔

[اور یہ اس دائمی زندگی میں بھی موت کی تمنا کرنے کا بیان ہے]

درجِ بالا حوالہ جات کے بعد آخرت کے منکروں سے مودبانہ سوال کیا جاتا ہے کہ بتایئے یہ کونسی آخرت ہے؟

کیا یہ آپ کے موقف کے مطابق اسی زندگی میں آنے والے کسی بہتر اور خوشگوار دور کا ذکر ہے؟

غالباً آپ کے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہیں ہے۔

ثانیاً: ملاحظہ فرمائیں انسانوں کے گروہوں کے لیے انفرادی حیثیت میں آخرت کے انعامات کی وعید، جس سے یہ بآسانی ثابت ہو جاتا ہے کہ آخرت کسی آنے والے ارتقاء یافتہ نسلی دور کا نام نہیں، بلکہ ہر اس انسان کا مقدر ہے جو ماضی، حال یا مستقبل میں پیدا ہوتا ہے اور اپنی طبعی زندگی گزار کر مر جاتا ہے:

آیت ۹/۱۰۰: **والسابقون الأولونَ من المهاجرين و الأنصار و الذين اتّبعوهم باحسان رضى الله عنهم و رضوا عنهُ و أعدّ لهم جنّات تجرى تحتها الأنهار خالدين فيها أبدا...**

"اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں سبقت لے جانے میں پہل کر گئے، جو مہاجرین اور ان کے مددگار دونوں قسم کے لوگوں میں سے تھے، اور وہ بھی جنہوں نے ان کی رضا کارانہ انداز میں متابعت کی، اللہ تعالیٰ ان کے عمل سے رضامند ہوا اور وہ اللہ کی رضا میں خوش ہوئے، اللہ نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کیے جن کے ساتھ دریا رواں رہتے ہیں اور جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہینگے۔۔۔"

اب فرمایئے کہ یہاں انسانی نسل کی کسی ارتقاء یافتہ پیڑھی کو مجموعی انداز میں کسی آنے والے دور کی بشارت دی جا رہی ہے یا ہر انسان کو انفرادی طور پر؟

اس آیت کی رُو سے تو، آنے والا دور تو کجا، ماضی بعید کے کچھ ایسے گروپس کو آخرت کے انعامات کی بشارت ہے جو ۱۴۰۰ برس قبل گزر چکے ہیں۔

کہیے کہ وہ کون سا اسی دنیاوی زندگی میں آنے والا دور ہے، اور کب آئے گا جس کی آپ بشارت دیتے ہیں؟

قارئین، آخر میں حیاتِ آخرت کو موت کے بعد کی زندگی تسلیم نہ کرنے والوں پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا استہزا کرنا بھی نوٹ فرمالیں:

آیات ۲۳/۳۳۔۳۷: **و قال الملأ من قومه الذين كفروا و كذبو بلقاءِ الآخرَةِ............ان هى الا حياتنا الدنيا نموتُ وَ نَحيا و ما نحنَ بمبعوثين..**

اور جس قوم نے انکار کیا اور آخرت میں پیش ہونے کو جھٹلایا اس قوم کے سرمایہ دار کہتے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہماری اس دنیاوی زندگی

کے سوا اور کیا ہے؟ ہم روٹین میں مرتے ہیں اور پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ہم موت کے بعد دوبارہ اٹھائے نہیں جائیں گے۔

آیت ۴۵/۲۴: **و قالوا ما هِیَ الّا حیاتنا الدنیا نموتُ و نحیا و ما یهلکنا اِلّا الدّهر. و مالهم بذلک من علم. ان هم الّا یظنّون..**

اور یہ لوگ کہتے ہیں اسی دنیاوی زندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ہم مرتے اور پیدا ہوتے رہتے ہیں اور یہ صرف وقت کا گزران ہے جو ہمیں ہلاک کر دیتا ہے۔دراصل اس معاملے میں وہ علم سے عاری ہیں۔یہ صرف قیاس ہی کر پاتے ہیں۔

اور اس کے بعد تو قارئین، قرآن کی رُو سے اس بارے میں کوئی شک وشبہ کا امکان باقی نہیں رہ جاتا کہ:

موت تجدید مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات
یہ نکتہ میں نے سیکھا ابوالحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی
اگر بیزار ہو اپنی کرن سے
موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

۔،۔،۔،۔،

مزید دیکھیے آخرت کے ضمن میں متعلقہ آیات:

البقرۃ:۴، ۸، ۶۳، ۸۶، ۹۴، ۱۰۳، ۱۱۴، ۱۲۶، ۱۳۰، ۱۷۷، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۱۷، ۲۲۰، ۲۲۸، ۲۳۲، ۲۶۴

آلِ عمران: ۲۲، ۴۵، ۵۶، ۸۵، ۱۴۵، ۱۵۲، ۱۷۶۔ النساء: ۳۸، ۵۹، ۷۴، ۷۷، ۱۳۴، ۱۳۶، ۱۶۲۔

المائدہ: ۵، ۳۳، ۴۱، ۶۹۔ الانعام: ۳۲، ۹۲، ۱۱۳، ۱۵۰۔ الاعراف: ۴۵، ۱۵۶، ۱۶۹۔ الانفال: ۶۷۔

التوبہ: ۱۸، ۱۹، ۲۹، ۳۸، ۱۱۴، ۴۵، ۶۹، ۷۴۔ التوبہ: ۹۹۔ یونس: ۶۴۔ ھود: ۱۶، ۱۹، ۲۲، ۱۰۳۔
یوسف: ۳۷، ۵۷، ۱۰۱، ۱۰۹۔ الرعد: ۲۶، ۳۴۔ ابراھیم: ۳، ۲۷۔ النحل: ۲۲، ۳۰، ۴۱، ۴۰، ۱۰۷، ۱۰۹، ۱۲۲۔
الاسراء:۷، ۱۰، ۱۹، ۲۱، ۴۵، ۷۲، ۱۰۴۔ طٰہ: ۱۲۷۔ الحج: ۱۱، ۱۵۔ المومنون: ۳۳، ۷۴۔ النور: ۲، ۱۴، ۱۹۔ النمل: ۳، ۴، ۵، ۶۶۔ القصص: ۷۰، ۷۷، ۸۳۔ العنکبوت: ۲۷، ۶۴۔ الروم: ۷، ۱۶۔ لقمان: ۴۔ احزاب: ۲۱، ۲۹، ۵۷۔ انبیاء: ۱، ۸، ۲۱۔ الزمر: ۹، ۲۶، ۴۵۔ غافر: ۳۹، ۴۳۔ فصلت: ۸، ۱۶، ۳۱۔ الشوریٰ: ۲۰۔ زخرف: ۳۵۔
المجادلہ: ۲۲۔ الحشر: ۳۔ الممتحنہ: ۶، ۱۳۔ الطلاق:۲۔ القلم: ۳۳۔ المدثر: ۵۳۔ القیامہ: ۲۱۔ الاعلیٰ: ۱۷۔ اللیل: ۱۳۔ الضحیٰ: ۴۔

تحقیقِ آخرت ازروئے جدید سائنس

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

آیئے قارئین، اب صحائف کی قدیم دنیا سے باہر قدم رکھیں اور اِک جہانِ تازہ کے افکار و احساسات کے ساتھ چلتے ہوئے اپنی تحقیق کی جولانگاہ جدید علوم کی جانب منتقل کر دیں۔ آیئے عقلیت پسندی [Rationalism] کی بنیاد پر حیات و ممات کے دائرے کو کائناتی تناظر میں سمجھنے کی کوشش کریں تا کہ عہدِ جدید کے مادہ پرستوں کی اس شکایت کا مداوا کیا جا سکے کہ الہامی ہدایت کی پیروی کرنے والے تو سائنسی حقائق کے معیار پر پورے نہیں اُترتے۔

یہاں یہ واضح کرنا بے جا نہ ہوگا کہ جدید علم بھی کائنات کو ایک مجموعی وحدت کی شکل میں ہی دیکھتا ہے اور اس کا زیادہ گہرائی سے مطالعہ کرنے کے لیے یہ کائنات کی تخلیق کو علم کے تین شعبوں یا تین سائنسز میں اس طرح تقسیم کرتا ہے:

۱] طبیعی سائنس جو مادے کے قوانین کو بیان کرتی ہے۔

۲] حیوانی یا حیاتیاتی سائنس جو حیوانی نظام کے قوانین کی تشریح کرتی ہے؛ اور

۳] انسانی یا نفسیاتی علوم جو انسانی ذہن کے قوانین کا مطالعہ کرتے ہیں۔

حیات اور موت کا تصور دو باہم متضاد و متناقض نظریات میں بٹا ہوا ہے۔ یعنی عملِ ارتقاء اور عملِ تخلیق۔ یا،،،، مادی جسم اور غیر مادی شعوری ذات۔ ہمارا زیرِ نظر موضوع، حیات بعد الممات، ان دونوں میں سے صرف ایک نظریے کے ساتھ وابستہ ہے۔ تخلیق کے نظریے کے ساتھ۔ یا غیر مادی شعوری ذات کے ساتھ۔ اگر ہم جدید علوم پر بحث و تحقیق کے ذریعے حیاتِ انسانی کو تخلیق کا نتیجہ ثابت کر دیتے ہیں، تو خالق کے وجود کا خودکار انداز میں اثبات ہو جاتا ہے، کیونکہ تخلیق کا عمل تخلیق کار، یعنی خالق کی ذات کے ساتھ لازم و ملزوم ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی مادے کی خود مختار اور لازمی ماخذِ تخلیق کی حیثیت کا نظریہ باطل ہو کر، انسان کی غیر مادی شعوری ذات کا نظریہ بھی وثاقت حاصل کر لیتا ہے۔ شعوری ذات کی اکائی کیونکہ غیر مادی حیات کی ایک منفرد وحدت ہے جو کبھی فنا نہیں ہوتی، لہذا حیات بعد از جسمانی موت بھی بالآخر اپنا وجود و جواز ثابت کر دیتی ہے۔

خالق کے وجود کا انکار حیاتِ آخرت کے انکار کا ماخذ یا مؤلد ہے۔ خالق کے وجود کا انکار روحانیت کے انکار سے بھی جڑا ہے اور جہاں روحانیت کا انکار ہوتا ہے وہاں زندگی کو مادیت کے ہی پیمانے سے پرکھا اور سوچا جاتا ہے۔ یہی وہ نقطۂ نظر ہے جس کے

تحت انسانی جسم کی موت کو انسانی حیات کا خاتمہ یا فنا کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔

کیونکہ خالق کا انکار اس پوری کائنات کو ایک حادثے کی پیداوار کے سائنسی نظریے کی طرف لے جاتا ہے، اس لیے حیاتِ انسانی کے تناظر میں کائنات کو ایک علیحدہ اور خود مختار وجود کی حیثیت دے دی جاتی ہے جس میں فطرت کی بے رحم قوتوں اور مظاہر کو انسان کیخلاف ایک ایسا دشمن قرار دے دیا جاتا ہے جس سے وہ مسلسل برسرِ پیکار ہے اور اپنے تحفظ و بقا کے لیے اس کے اسرار جاننے اور اسے تسخیر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

تو معزز قارئین، سائنس کی رُو سے حیاتِ انسانی کی بقا کے تسلسل کو آئندہ، یعنی حیات بعد الممات کے مرحلے کے حوالے سے ثابت کرنے کے لیے ہمیں چند حقائق کی تحقیق کرتے ہوئے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ ہمیں گمراہ کیا گیا ہے اور تصویر کا صرف ایک رخ دیکھنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ وہ حقائق کچھ اس طرح ہیں:۔

۱] حیات یا زندگی دراصل کیا ہے؟

۲] اس کا اصل ہدف، مقصد یا نصب العین کیا ہے؟

۳] زندگی کا ماخذ کیا، یا کون ہے؟

۴] زندگی انسانی مرحلے تک کیسے پہنچی اور اسے صرف مادی روپ دینا کیسے گمراہ کن ہے؟

۵] ایک خالق کے وجود کا کیا ثبوت و جواز ہے؟

۶] موت کا سرِّ نہاں کیا ہے؟

۷] یہ کائنات حیاتِ انسانی کے تناظر میں کیا حیثیت رکھتی ہے؟

۸] یہ کائنات حادثے کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے یا ایک سوچی سمجھی منصوبہ بند تخلیق ہے؟

۹] مغرب سے آئی مختلف مادیت پر مبنی تھیوریاں جو حیات کی ابتدا پر روشنی ڈالتی ہیں کس طرح غلط، بے بنیاد اور تباہ کن ہیں؟

غالباً ان نکات کی تحقیق کے بعد، جس کے ضمن ہم فزکس، بایولوجی اور نفسیات کے علاوہ علمِ فلکیات سے بھی الجھیں گے، ہمیں ایک ایسا سیر حاصل مطالعہ حاصل ہو جائیگا جس کے بعد یہ تعین کرنا ہمارے لیے کچھ بھی مشکل نہ ہوگا کہ حیاتِ انسانی اپنی بایولوجیکل موت کے بعد بھی ایک خالص غیر مادی روپ میں جاری رہتی ہے۔ اور اسی کو حیات بعد الممات کہا جاتا ہے۔ نیز یہ تمام حقائق ایک قطعی اور طاقتور ترین ماورائی وجود کی پرزور نشاندہی اور تصدیق و توثیق کرتے ہیں۔

حیات کی تخلیق و ماہیت پر ایک سیر حاصل تجزیہ

نہ کچھ تھا تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہماری تحقیق ابتدائی نکتے سے شروع ہوتی ہے کہ زندگی کیا ہے۔ مادی جسم یا غیر مادی شعوری ذات۔ اور اس کے لیے ہمیں علم و عرفان کی ان گھاٹیوں سے گزرنا ہے جہاں سے انسان ہی نہیں بلکہ تخلیق کے مجرد عمل کی ابتدا ہوتی ہے۔ جہاں حریمِ غیب کے بلند ایوانوں میں، اسرار کے دھندلکوں میں لپٹے دبیز پردے سرسراتے ہیں، اور دفعتاً سکوت کی ازلی حکمرانی اور تاریک خلاؤں کی لامحدود وسعتوں میں، پہلی مرتبہ ایک پُر اسرار، ملکوتی، ذی وقار و عظمت، پُر ہیبت و جلال، حیات آفریں صدا گونجتی ہے، جو بزبانِ حال حکم دیتی ہے کہ ''روشنی پیدا کی جائے''[let there be light]، تا کہ ''تخلیق کا عمل شروع ہو'' [کُن]۔

دائمی ظلمتوں میں مستور، خفتہ قوتیں برسرِ عمل آتی ہیں اور، سائنس کی دریافتوں کے مطابق، اولین تخلیق، کائناتی روشنیوں کی لہروں کا منبع، کائنات کا پہلا ذرہ، فوٹون[photon particle]عالمِ وجود میں آجاتا ہے، جس کا ساکن حجم[rest mass]، فزکس کی روشنی میں، زیرو ہے، جس کی بنا پر اس کی مزید تقسیم ممکن نہیں۔ اسے تقسیم کرنے کی ہر کوشش پر وہ اپنی حرکی قوت کو توڑ کر معدوم ہو جاتا ہے۔ یہ ذرہ اپنی رفتار کو جو کہ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے، مزید بڑھانے پر قادر نہیں۔ ایسا ہو تو اس کی موجودہ رفتار بھی ختم ہو جائے گی اور ذرہ معدوم ہو جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں کائنات کی تخلیق کے عمل نے اپنی حرکت پذیری کے لیے اپنی پہلی ابتدا ہی سے ایک حدِ رفتار متعین کر لی۔ فزکس کے ماہرین کے مطابق فوٹون کا حجم اس کی حرکی توانائی [kinetic energy]کے سبب سے ہے۔ فوٹون حرکی طاقت کا مالک ہے۔ اس کی رفتار کم کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ کسی بھی ایسی کوشش کے نتیجے میں یہ معدوم ہو جاتا ہے۔ اور نتیجتاً ایک الیکٹرون اور ایک پوزیٹرون کا جوڑا نمودار ہوتا ہے۔ پوزیٹرون دراصل ایک پازیٹو الیکٹرون ہے۔ یہ عمل ایک جوڑے کی پیداوار[pair production]کے نام سے جانا جاتا ہے اور اس کاروائی کو ''توانائی کی مادیت سازی'' [materialization of energy]کہا جاتا ہے۔ یہ کائنات کی تخلیق کے عمل کا وہ اولین مرحلہ تھا جس نے ایک عظیم تخلیقی خواہش اور تقاضے[urge]کے تحت اپنا طویل سفر شروع کیا۔ اس خواہش اور تقاضے نے تخلیقی عمل کو ''کِک سٹارٹ'' کرنے کے لیے روحانی کشش کا ایک عظیم برقی چارج پیدا کیا جو ایک قوتِ محرکہ کی مانند روبہ عمل ہوا۔

زندگی کیا ہے؟ یہ سوال آج تک اسرار کے پردوں میں لپٹا ہوا ہے اور ہنوز حل طلب ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ انسان خود اپنی حیات کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ حیات کے بارے میں جاننے کا مطلب حیات کے مقصد کو جاننا ہے اور جب تک انسان اُس مقصد کو نہیں جان لیتا، وہ خود کو نہیں جان سکتا۔ لہٰذا اس سے قبل کہ ہم اس سوال کا جواب تلاش کریں کہ حیات دراصل کیا ہے، یہ

لازم آتا ہے کہ انسان اپنی تخلیق کے مقصد کو جانے اور اُس مقام کو جان لے جو اس کی منزلِ مقصود ہے۔ اگر آدمی خود کو اپنے مقصد کے تناظر میں شناخت کر لے، تو یہ نہ صرف حیات کے اسرار کو پا سکتا ہے بلکہ پوری کائنات کے رازوں سے بھی پردہ اٹھا سکتا ہے۔ یہ اس لیے کہ کائنات ایک علیحدہ وجود [entity] کی حیثیت سے موجود نہیں ہے، اور اسی طرح آدمی بھی اس کائنات میں ایک بیرونی مداخلت کار [intruder] کی حیثیت نہیں رکھتا۔ کائنات دراصل انسان کی تشکیل کی طویل تاریخ ہے۔

جب ہم اس کائنات پر غور کرتے ہیں اور ان قوانینِ فطرت کا تجزیہ کرتے ہیں جو اس کے طول و عرض میں خود مختار طریقے سے پھیلے ہوئے ہیں، تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ قوانین جو ہمارے اپنے ذہنوں کی پیداوار یا تشکیل ہیں، مکمل طور پر اُن قوانین سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدمی تخلیق کے بلند ترین مقام پر کھڑا ہے۔ کیوں کہ طویل تخلیقی کارگزاری کے نتیجے میں جو بھی ٹھوس عنصر آدمی کے اندر نمودار ہو کر سامنے آیا ہے وہ اس کا ''شعورِ ذات'' ہے، لہذا ہم قطعی طور پر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کائنات میں جاری وساری تمام عملی کاروائیاں اپنے اندر شعور کی صفت یا خصوصیت رکھتی ہیں۔

پس، کائنات آدمی سے الگ رہ کر زندہ نہیں ہے۔ نہ ہی وہ ایک خود مختار وجود رکھتی ہے۔ یہ تو انسان کا مؤلد اور اس کا گہوارہ ہے جس کی وساطت سے اُس کی روح یا ذات کی تعمیر ہوئی ہے۔ آسمانوں اور زمین پر مظاہرِ فطرت کے ساتھ انسان کی گہری شناسائی اس موقف کو مضبوط کرتی ہے کہ آدمی کائنات کی تخلیقی کاروائیوں کے قالب سے گزر کر اپنے موجودہ سطحِ شعور تک پہنچا ہے۔ اسی وجہ سے آدمی کا کائناتی ماضی اس کی روح پر خاطر خواہ گہرائی سے نقش ہو چکا ہے۔ وہ تمام اوصاف جو کائنات کے تخلیقی عمل کے نتیجے میں سامنے آتے ہیں، انسانی ذات میں بھی پائے جاتے ہیں۔ انسان ابھی تک تکمیل کے مراحل میں ہے، اور اس کی روح بھی، جو ابھی تک نامکمل ہے۔ یہ حقیقت کہ انسان کا طبیعی وجود ایک مخصوص سطح تک پہنچنے کے بعد مزید افزائش کے قابل نہیں رہتا، مگر انسان کی ذہنی اور روحانی صلاحیتیں مسلسل ترقی پذیر رہتی ہیں، اس بات کا اشارہ ہے کہ اگر تخلیقی کاروائیاں کائنات میں اب بھی جاری وساری ہیں تو ان کا مقصود کچھ اور نہیں بلکہ انسانی ذات یا روح کی تعمیر ہے جو کہ بتدریج کاملیت کی طرف بڑھتی جا رہی ہے۔ لہذا انسان نہ صرف اس کائنات کا اہم ترین جزء ہے بلکہ تخلیق کے سارے عمل کے پیچھے چھپا ہوا مقصد بھی وہ خود ہی ہے۔

انسان کی خود کو جاننے کی خواہش اور اس کا اعتراف کہ وہ اب تک خود آگاہی کے مکمل درجے تک نہیں پہنچ سکا، بے شک بہت کچھ انکشاف کرتا ہے۔ اولاً تو یہ اس بات کی نشانی ہے کہ اپنے باطن کی گہرائیوں میں، کہیں دُور اندر، انسان کو ایک مخصوص ہستی کے وجود کے بارے میں یقین دلا دیا گیا ہے۔ اگر اسے یہ یقین دہانی نہ ہوتی تو اپنی ذات کو جاننے کا اور اپنی زندگی کے مقصود کی کھوج لگانے کا سوال ہی اس کے ذہن میں پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ ثانیاً، اس کا یہ اعتراف یا احساس کہ وہ ابھی خود کو جان نہیں پایا، یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان ابھی تک اپنے تکمیلی مراحل میں ہے۔ یہی اس مسئلہ کی اصل و بنیاد ہے۔

انسان کی ذات یا روح اُس وقت تک کبھی بھی مطمئن نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ اُس ہستی سے آ گاہی حاصل نہ کرلے جس کی موجودگی کا احساس اسے بے چین کیے رکھتا ہے۔ یعنی دراصل حقیقت کو جاننے کا تقاضا خارجی اثرات کا مرہونِ منت نہیں۔ یہ اس کے باطن ہی سے اٹھتا اور اسے بے چین کیے رکھتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ جب تک انسان اپنی ذات کی حقیقت یا اپنی حیات کے مقصد کے بارے میں مکمل آ گاہی حاصل نہ کرلے، کوئی بھی چیز اسے تسلی نہیں بخش سکتی۔ تاہم اس کا یہ جان لینا کہ وہ نامکمل ہے، بذاتِ خود اس بات کی گارنٹی ہے کہ حقیقت کو جان لینا اس کا مقدر ہے اور اسے ایک عظیم مقصد حاصل کرنا ہے۔

اندریں حالات، انسان مادے کی تشکیل نہیں ہوسکتا۔ مادہ تو خود ایک تخلیق ہے۔ یہ اپنا ایک خاص رویہ رکھتا ہے اور قوانین کو قبول کرتا ہے۔ ایک متحرک ذرے سے لے کر سوچنے والے انسان تک، کائنات کی تمام تر عملی کاروائیاں دراصل انسان کی تخلیق کی کاروائیاں ہیں۔ خود کو جاننے کا عظیم انسانی تقاضہ دراصل اس کے باطن کا اپنے خالق کو جاننے کا روحانی تقاضہ ہے۔ یہ ایک موروثی تقاضہ ہے اور اس تقاضے کے پیچھے جو قوت ہے، وہ خالق کی غیر شعوری محبت ہے۔

کائنات میں انسان کی خود آ گاہ تخلیق سے ماقبل کے تمام تخلیقی مراحل میں حیات ایک ابتدائی یا کمتر شعوری سطح رکھتی تھی، اس لیے ان مراحل میں حیات اپنے خالق کے وجود کا براہ راست احساس یا آ گہی حاصل نہیں کرسکتی تھی۔ ہم حیات کے ان مراحل کو زندگی کی نباتاتی حالت کا نام دیتے ہیں جو مادے کی علامتی اشکال و کیفیات میں رہتی ہیں۔ پھر بھی، ان کمتر مراحل میں بھی حیات میں خالق کے لیے ایک موروثی کشش موجود تھی اور اس روحانی محبت کی تسکین کیلیے حیات نے ایک وحدت کی شکل میں رہتے ہوئے بھی اپنی صفات کو اندرونی طور پر ہی، طبیعی مرحلے میں، دو کششوں کے مقناطیسی نقاط، اور حیاتیاتی مرحلے میں دو مخالف جنسی اصناف میں ایک مصنوعی تقسیم کے ذریعے بانٹ لیا تھا۔

انسان کے خود آ گاہ مرحلہِ حیات میں انسان کی روح یا ذات نے جو کائنات کے ماحصل کی شکل میں نمودار ہوئی، اپنے اندر سے خالق کی صفات کو منعکس کرنا شروع کردیا، اور اس عمل نے اسے خالق کی موجودگی کا براہِ راست ادراک یا احساس عطا کیا۔ انسانی ذات اپنے باطن میں خالق کی موجودگی کا براہِ راست احساس رکھنے کی وجہ سے تخلیق کے نباتاتی درجے سے بلند ہوجانے کی بناء پر، اپنے روحانی تقاضوں کو اپنے طبیعی جسم کی مصنوعی تقسیم کے ذریعے بھی وہ تسکین فراہم نہ کرسکی جو طبیعی اور حیاتیاتی مراحل میں حیات نے حاصل کر لی تھی۔ انسانی ذات، جو اَب خالق کا براہِ راست عکس اپنے اندر پاتی تھی، اپنے لاشعور کی گہرائیوں سے خالق کی تلاش میں مصروف ہے اور اس مقصد کے تحت وہ اپنے تصوراتی پیکر [Ideals] تراشتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، انسانی ذات اپنی ذہنی یا روحانی سطح پر اپنے باطن میں خالق و مخلوق کے باہمی تعلق کی الجھنوں میں بٹی ہوئی ہے، اور نتیجتاً وہ اپنی روحانی آ گہی کی روشنی میں جو اس کی ذات میں منعکس ہوتی

ہے،اپنے خالق کوتلاش کرتی ہے۔

کیونکہ انسان ابھی تکمیل کے سفر میں ہے اور ابھی خالق کو پوری طرح سمجھ نہیں پاتا،اس لیے وہ غلطی کے ارتکاب کا امکان رکھتا ہے اوراس کی محبت کو اپنی موجودہ شعوری سطح پر کسی کمتر آئیڈیل کی طرف مرکوز کر دیتا ہے۔مثلاً جب ہم انسانی تاریخ کی طرف دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ فطرت کے مظاہر کے زیرِ اثر انسان سورج،ستارے،دریا اور آگ جیسے عناصر کی پرستش کرتا رہا ہے۔ وہ ان عناصر کو مافوق الفطرت حیثیت دیتا رہا ہے اور انہیں خالق اور پروردگار سمجھتا رہا ہے۔ نیز اپنے روحانی تقاضے کی تسکین کے لیے اور ان عناصر کی عنایات اور خوشنودی حاصل کرنے کیلیے وہ ان کے حضور قربانیاں بھی پیش کرتا رہا ہے۔ اسی کی مانند،بھوک،بیماری،قحط اور جنگوں سے خوفزدہ انسان،بتوں کی پرستش میں ملوث رہا ہے۔ ہر بُت کو ایک تصوراتی طاقت تفویض کر دی گئی تھی جیسے کہ بیماریوں سے شفا دینے والا،،، رزق اور دولت دینے والا،،،قحط اور جنگوں میں تحفظ دینے والا،،،وغیرہ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان اپنی ابتدا ہی سے ایک ایسی ہستی کے وجود کی راست آگہی رکھتا تھا جو اس کی سوچوں کے مطابق خود آگاہ تھی،جیسے کہ انسان خود۔

اگر انسان کے باطن میں ایک مافوق الفطرت طاقت کے وجود کی راست پہچان نہ ہوتی،جسے وہ اپنی زندگی عطا کرنے اور پرورش کرنے والا نہ سمجھتا،تو وہ کبھی بھی سورج اور ستاروں،دریاؤں اور سانپوں،بتوں اور انسانوں کی پرستش نہ کرتا۔ وہ صرف اسی سادگی سے اپنی زندگی گزارتا جیسے حیوانات گزارتے ہیں۔ کیونکہ انسانی زندگی کی بنیادی ضروریات وہی ہیں جو حیوانی زندگی کی ضروریات ہیں۔ البتہ کسی حیوان نے کبھی بھی فطرت کے مظاہر کی پرستش کا ارادہ نہیں کیا اور نہ ہی کبھی اس نے کسی وجود سے کسی مدد کی درخواست کی۔ اس امر کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ تخلیق کے حیوانی مرحلے تک،زندگی میں اپنے خالق کی راست شناخت موجود نہ تھی۔

بتدریج،جوں جوں انسان علم حاصل کرتا گیا،اس کا تصورِ حیات اور کائنات تبدیل ہوتا گیا۔لیکن یہ تبدیلیاں اسے حقیقت کو جاننے کے باطنی تقاضے سے محروم نہ کر سکیں۔ وہ اپنی ذات کی نفی نہ کر سکا اور نہ ہی اپنی فطرت سے انکار کر سکا۔ مذکورہ تبدیلیاں دراصل اس کی ذات نے ہی اس پر اس لیے نافذ کیں کہ وہ ایسے برتر آئیڈیلز کا تعین کر سکے جو اسکے اندرونی تقاضے کی تسکین کر سکیں۔ لہذا بہتر آئیڈیلز کے لیے لائی گئی یہ تبدیلیاں خارج سے مسلط نہیں کی گئیں کیونکہ اس بارے میں تعین کرنے اور فیصلہ کرنے والی ہستی خود انسانی ذات تھی۔ وہ آئیڈیلز جو انسان کے اندرونی تقاضے سے پوری مطابقت نہیں رکھتے تھے،اور نہ ہی اُس تقاضے کی تسکین کر پاتے تھے، کالعدم کر کے ناکارہ قرار دے دیے جاتے تھے۔ اگر اپنی ابتدائی سطح پر انسان نے فطرت کے عناصر کو اپنی زندگی کے پروردگار یا تخلیق کار کے طور پر لے لیا، اور اگر اس نے انسانوں اور بتوں کو مافوق الفطرت درجہ دے کر ان کی پرستش کی،تو آج کا انسان بھی اس امر پر مجبور ہے کہ کائنات کے تشخص کا تعین کرے،تا کہ اس کے حقیقت کو جاننے کے باطنی تقاضے کو پورا کیا جا سکے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اگر ماضی کا غاروں میں رہنے والا انسان مظاہرِ فطرت پر یقین رکھتا تھا تو عہدِ جدید کا انسان اُس مادے کے ہمہ نفوذ اور ہمہ گیر وجود پر یقین رکھتا ہے جس

کے بارے میں اسے باور کرایا گیا ہے کہ یہ ہی انسانی زندگی کا سرچشمہ ہے۔ بالفاظِ دگر، جدید انسان اس بات پر متفق ہے ایک ''جاہلِ مطلق'' علم والوں پر حکومت کر رہا ہے۔

وہ اپنی حیات کے آزادی، عقلیت، دانائی، محبت، ہمدردی اور حقیقت کی تلاش جیسے اوصاف سے دست بردار ہونے پر آمادہ ہے۔ وہ متفق ہے کہ زمین پر انسانی حیات ایک حادثہ کی وجہ سے کچھ عناصر کے امتزاج کے ذریعے پیدا ہوگئی ہے۔ ان عناصر کی ٹوٹ پھوٹ کے ساتھ ہی انسان دوبارہ مادہ میں گم ہو جاتا ہے۔ مادی قوتوں کے نظریے کے حامی مختلف گروہوں میں تقسیم ہیں۔ کچھ اس نظریے کے حامی ہیں کہ طاقتور مادہ ایک اندھی قوت کے مانند موجود ہے۔ یہ نہ کوئی قانون رکھتا ہے، نہ اصول، اور اسی لیے نہ کوئی مقصد۔ کچھ دوسرے یقین رکھتے ہیں کہ مادہ ہمہ جہت ہے جس کے قوانین حیات کا تعین کرتے ہیں اور ساتھ ہی انسان کی شعوری ذات کا بھی۔ دوسرے الفاظ میں انسانی ذات مادی قوتوں کی ایک ارتقاء یافتہ شکل ہے۔ ان نظریات کے علاوہ، ایسے مفکر بھی ہیں جو طاقتور جبلتوں پر یقین رکھتے ہیں جو، ان کے نظریے کے مطابق، حیات کو کنٹرول کرتی ہیں۔ ایک نامور مغربی مفکر یہ یقین رکھتا تھا کہ انسان جنسی جذبہ کے تابع ہے۔ اُس کے خیال میں انسانی زندگی کی تمام سرگرمیوں کے پیچھے جنسی جذبہ ہی واحد حقیقت اور محرک ہے۔ ایک اور مفکر نے اپنی تمام فلاسفی خوراک کے حصول کے جذبے کے گرد تعمیر کی۔ کتنی عجیب صورتِ حال ہے کہ لوگوں نے ان تمام نظریات کو برداشت کیا اور نتیجے میں نا قابلِ اصلاح نفسیاتی اور جسمانی عوارض برداشت کیے جو انسانی تہذیب کے لیے تباہ کن اثرات کے حامل تھے۔

کیونکہ ان نظریات کے مطابق زندگی ایک مشین سے زیادہ کچھ نہ تھی، جس کی کوئی بھی روحانی اہمیت نہ ہو، لہٰذا اخلاقیات کو بھی ریاضیات کی مانند ایک ایسی سائنس کے طور پر لے لیا گیا جو کہ روحانی اقدار سے آزاد، انسانی علوم کی ہی ایک اور شاخ ہو۔ اسی سوچ کی مطابقت میں، بجائے بلند تر اقدار کی طرف ترقی کر جانے کے، ان اخلاقیات کو اُن مادی ضروریات کی تسکین پر زور دینے کا ذریعہ بنا لیا گیا جو حیات کے حیوانی پہلو سے متعلق تھیں، یعنی جبلت کی تسکین اور حیات کا تحفظ۔ ان مقاصد کی تکمیل کیلیے اگر یہ لوگ افراد اور اقوام سے دھوکا بازی کا استعمال کریں یا انسانیت کا خون کرنے پر اُتر آئیں، تو پھر بھی حق پر ٹھہرتے ہیں۔ جدید معاشروں نے ان جرائم کے ارتکاب کو جدید تہذیب کا نام دے کر اداروں کی صورت میں ترقی دے دی اور اس طرح انسان کو جبلی لذتوں کے حصول کا کھلا لائسنس دے دیا۔ انہوں نے اپنے متبعین کو بتایا کہ اگر وہ اپنے جبلی جذبوں کی تسکین کرنے میں ناکام ہوئے تو انہیں ذہنی عوارض اور اذیت برداشت کرنی پڑی گی۔

اس فلسفہ کا سب سے زیادہ المناک پہلو جو ہم نظر انداز کر دیتے ہیں، یہ ہے کہ انسان نے اپنی شعوری ذات کے عظیم روحانی تقاضوں کو کھو دیا اور ان کا رُخ جبراً جبلتوں کی تسکین کی طرف موڑ دیا جیسے کہ جبلت ہی زندگی کا بڑا محرک ہو۔ جب جبلت کی تسکین ہی مقصدِ حیات ٹھہرا، تو ہم مختلف معاشروں کے مابین مادی اسباب و ذرائع کی تحصیل کے لیے ایک پاگلانہ مسابقت کے سوا اور کیا

توقع کرسکتے ہیں؟ اس مسابقت کی کوئی حدود بھی نہیں ہیں کیونکہ اس کی پُشت پرشعوری ذات کالامحدود دباؤ موجودرہتاہے جوکبھی بھی ادنیٰ درجے کی شعوری اقدار سے بہلایانہیں جاسکتا۔ لہذا جدید دنیا میں موجودتمام نفسیاتی جنونوں وخلل کی جڑبنیادانہی جبلتوں کی تسکین کیلیے کی جانے والی پاگلانہ مسابقت ہے جواس لیے غیر معمولی حدوں کو چھورہی ہے کہ انسانی ذات کے طاقتورتقاضے مادی ضروریات کو پورا کرنے کی طرف موڑدیے گئے ہیں۔

انسان کیونکہ ابھی تکمیلی مراحل میں خوار وزبوں ہےاس لیےاس میں اپنی ذات کے تقاضوں کوغلط شناخت کرنے کا رجحان موجودہے،جنہیں وہ مادی ضروریات کی تکمیل کی شکل میں تعبیر کرلیتاہے۔ تاہم معاشرتی ڈھانچوں کی تاریخ کی رُوسے یہ غلط شناخت دائمی حیثیت اختیارنہیں کرپاتی، اورانسانی فطرت جلدیابدیرایک نظام کومستردکرنااوردوسرے کواختیارکرناشروع کردیتی ہے۔ اس کی وجہ جبلی ضروریات کی تسکین نہیں ہوتا کیونکہ یہ ضروریات تومتعین ہوتی ہیں۔۔۔۔درحقیقت ان معاشرتی انقلابوں کے پیچھےاُسی شعوری ذات کادباؤہوتاہے جوخودکواپنی موروثی صفات اورروحانی اقدار کے ساتھ شناخت کرناچاہتی ہے۔

تخلیق کے تمام مراحل کے دوران خالق زندگی کی راہنمائی کرتارہاہے۔ اپنی تخلیق کے معاملے میں فطرت اتنی مہربان اوراتنی فکرمند ہے کہ ایک بچے کی پیدائش سے قبل ہی وہ اس کی جسمانی ضروریات کیلیے دودھ تیاررکھتی ہے۔ لہذااسی بنیادپرخالق نے انسان کواس کے روحانی تقاضوں کی تسکین کیلیے خاص روحانی خوراک بھی فراہم کی ہوگی۔ہم بصورتِ عمومی بھی فطرت کی کارکردگی میں کوئی خلایاکوئی رخنہ نہیں پاتے۔ پس اگرفطرت نے انسان میں خودکوجاننے کی طاقتورخواہش ودیعت کردی ہے،اوراس ذریعے سےاُس کے خالق کوجاننے کی بھی،تولازم ہے کہ ایک غلطی سے پاک اہتمام اُس روحانی تشنگی کومٹانے کے لیے بھی کردیاہوگا۔یہ روحانی خوراک خالق نے اپنے پیغمبروں،یعنی انتہائےشعورتک پہنچے ہوئے انسانوں کے ذریعے فراہم کی ہے۔انسانی تاریخ ان حقائق کی گواہ اورثبوت ہے۔ جدیدعہد کےانسان نے البتہ الہامی ہدایت کی روشنی میں مقصدکی طرف پیش قدمی کرنے کی بجائےخودانسان ہی کے متعین کردہ آئیڈیلزیامقاصدکااتباع شروع کردیاجوکبھی بھی درست اورکامل نہیں ہوتے۔ انسان جوخودابھی تکمیل کے مراحل میں ہے،اپنی ہنوزکم ترشعوری سطح پرانسانیت کے مثالی پیکریاآئیڈیل کاتعین نہیں کرسکتا۔ اس لیےآئیڈیل کا درست تعین خالق ہی کرسکتاہے جوتخلیق کےعظیم ترمقصدکی بنیادپرکیاگیاہو۔

انسان نےکبھی اتناعذاب نہیں جھیلا ہوگا جیساوہ ایسے جعلسازوں کے ہاتھوں جھیل رہاہے جویہ دھوکادیتے ہیں کہ وہ زندگی کامقصدیاماخذمتعین کرسکتے ہیں۔ تاہم انسان اپنے موروثی تقاضے کے خلاف نہیں جاسکتا۔ اسے الہامی راہنمائی کی طرف پلٹناہی ہے جوکہ انسان کے لیے صحیح آئیڈیل فراہم کرتی ہے تاکہ انسانی ذات کوروحانی تسکین اورخوشیوں کی معراج تک پہنچادے۔

تمام خودساختہ نظریات مادے کوایک خودمختاروجودکادرجہ دیتے ہیں۔ مادہ ایک خودمختاروجودکی حیثیت میں موجودنہیں

ہے۔ وہ زندگی کے بالکل ابتدائی مرحلے کی شکل میں موجود ہے، جیسے کہ دیگر تخلیق شدہ مراحلِ زندگی، مثلاً نباتاتی اور حیوانی مراحل۔ زندگی بہت سے تخلیقی مراحل سے گذر چکنے کے بعد موجودہ انسانی مرحلہ میں نمودار ہوئی، جہاں وہ خود آگہی یا شعورِ ذات سے ہمکنار ہوگئی۔ اس کا مطلب سیدھا سیدھا یہی ہے کہ اس مرحلہ پر زندگی نے اپنے باطن میں اپنے خالق کا عکس دیکھنا شروع کر دیا۔ یہ صرف خود آگہی یا شعورِ ذات ہی کی وجہ سے ہے کہ انسان خود کو مادی مراحلِ زندگی سے آزاد کرنے کے قابل ہوا ہے۔ انسانی مرحلہ سے قبل زندگی ایک مادی حالت میں متحرک تھی اور اُس حالت میں اسے خالق کی راست آگہی نہیں تھی۔ اُن مراحل میں زندگی قیاس، اندازے[inference] اور علامتوں[symbols] کے ذریعے پیش قدمی کرتی رہی۔ آسان الفاظ میں، مادی حالتِ حیات، حیوانی مرحلے تک، یوں سمجھی جا سکتی ہے جیسے کہ مختلف ادوار میں اس کی پال پوس اور پرورش ایک جنین کی شکل میں رحمِ مادر میں کی جا رہی ہو۔ اس قسم کی حالتوں میں زندگی علامتی تفریق [symbolic differentiation] کے ذریعے قائم رہتی اور ترقی کرتی ہے اور کبھی اپنی ماں کے وجود اور خارجی دنیا سے آگاہ نہیں ہو پاتی۔

اسی کے مانند، حیوانی مرحلے کی تکمیل کے بعد، انسان کی اس کے خود آگاہ مرحلے پر نمود،، اس کے خالق کی روحانی دنیا میں اُس کی پیدائش کے مماثل تھی جہاں وہ اپنے خالق کی براہِ راست پہچان کی تلاش میں منہمک رہا ہے۔ یہ بالکل اس طرح ہے جیسے ایک نومولود اپنی پیدائش کے فوراً بعد اپنی ماں کی تلاش اور پہچان کرنے کی سعی کرتا ہے۔

ان حقائق کے ادراک کے بعد ہم کیسے یہ تصور کر سکتے ہیں کہ اتنے طویل سفر اور گوناگوں کیفیات و مراحل سے گذر کر حیات جس ترقی یافتہ مرحلے میں داخل ہوئی ہے، وہ صرف اس لیے کہ فنا کے گھاٹ اُتر جائے۔ کسی عطائی سے مستعار لیا ہوا فلسفہ اس فنا کا جواز پیش نہیں کر سکتا۔ اصلِ حیات شعور ہے اور شعور ایک غیر مادی حقیقت رکھتا ہے، خواہ وہ شعورِ مطلق ہو یا انسانی زندگی۔ انسانی زندگی کو مادے سے نجات پا کر خالص شعور کے مرحلے میں داخل ہونا ہے جہاں ارتقاء کے لامحدود امکانات اُس کے منتظر ہیں۔ یہی وہ آخری مرحلہ ہے جہاں زندگی کی حقیقت اور مقصد بارز ہو کر سامنے آنا ہے۔

جدید تصورِ حیات جو دہریت[atheism] اور تشکیک[agnosticism] پر مبنی ہے، انسانیت کو ابتری اور مایوسی کی دہلیز پر لے آیا ہے۔ خود ساختہ نظریات اور بہت سی سائنسز نے جو انسان نے دریافت کیں اور ترقی دی ہیں، انسانیت کو مزید تقسیم کر دیا ہے۔ یہ سوچ کہ مادہ یا توانائی نہ ہی تخلیق کردہ ہیں اور نہ ہی تباہ ہوتے ہیں، سائنسدانوں کا پیش کردہ سب سے زیادہ گمراہ کن نظریہ ہے۔ یہ نظریہ جو کہ آج عالمی سطح پر تسلیم کردہ ہے، کائنات کے تخلیقی طریقِ کار سے نابلد ہونے کے باعث گھڑا گیا ہے۔ اگر ہم یہ نظریہ قبول کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ خدا کی ہستی نہیں جو دائمی حیثیت کی مالک ہے، بلکہ یہ مادہ یا توانائی ہے جو دائمی وجود رکھتی ہے اور حقیقتِ مطلق ہے۔ یہ بے شک ان لوگوں کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے جو نسلِ انسانی کی روحانی اقدار پر یقین رکھتے ہیں۔ اُن لوگوں کا

یہ فرض ہے کہ وہ اس تھیوری کو دھوکا بازی اور مبنی بر جہالت ثابت کریں۔

ایک دیگر خطرناک ترین تھیوری جس نے انسانی سوچ کو مقید کر دیا ہے وہ ارتقاء[evolution] کی تھیوری ہے۔
یہاں بھی اگر ہم اسے حقیقت کے طور پر قبول کرلیں تو ہم دراصل خدا کے وجود کی نفی کر رہے ہوں گے۔ جدید انسان کی تیار کردہ یہ تھیوری بھی آج عالمی طور پر تسلیم کی جاتی ہے۔ بالفاظِ دگر، فزکس کے ماہرین اور ارتقائی دانش ور یہ چاہتے ہیں کہ ہم یقین کرلیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ذات نہیں جو لافانی ہے اور کائنات کی خالق، بلکہ یہ مادہ یا توانائی ہے جو کہ حقیقت ہے اور کائنات کو ارتقاء دے رہی ہے۔

اس جائزے کے آخر میں علامہ اقبال کے ''اسلام میں مذہبی فکر کی تعمیرِ نو'' کے عنوان سے دیے گئے لیکچروں سے ایک اقتباس پیش کرنا غیر متعلق نہ ہوگا:۔

'' کلاسیکل فزکس نے خود اپنی بنیادوں پر نکتہ چینی کرنا سیکھ لیا ہے۔ اس نکتہ چینی کے نتیجے میں وہ خاص نوعیت رکھنے والی مادیت پرستی جو اس نے اصلاً ضروری سمجھی تھی، تیزی سے غائب ہو رہی ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب مذہب اور سائنس آج تک شک وشبہ سے بالا، ہم آہنگی کے میدان دریافت کرلیں۔ تاہم یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ فلسفیانہ سوچ میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جسے حتمی یا آخری کہا جائے۔ جوں جوں علم بڑھتا جاتا ہے اور سوچ کے تازے دَر وا ہوتے جاتے ہیں، دوسرے تصورات، ممکنہ طور پر بہتر تصورات، بمقابلہ ان کے جو ان لیکچرز میں سامنے لائے جا رہے ہیں، سامنے آنے ممکن ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ انسانی سوچ کی ترقی کو محتاط نظر سے دیکھتے رہیں اور اس کی طرف ایک بے لاگ، خودمختار تنقیدی رویہ قائم رکھیں۔

انسانیت کو صرف تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ کائنات کی ایک روحانی تشریح وتوضیح، فرد کی روحانی آزادی اور کائناتی اہمیت رکھنے والے وہ بنیادی اصول جو انسانی معاشرے کی روحانی بنیاد پر ارتقاء کی طرف راہنمائی کریں۔''

کائنات اور شعورِ مطلق [خالق]

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات　　　خودی کیا ہے، بیداری ءِ کائنات

ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے　　　نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

آ یئے اب چند سطور میں یہ ثابت کر دیا جائے کہ مادے [matter]،،،، نیچرل سیلیکشن [natural selection]،،،، اور خودکار ارتقاء [automatic evolution] کے نظریات کیسے باطل ٹھہرتے ہیں۔ اور ایک خالق کا وجود ثابت ہو جانے پر ''حیاتِ آخرت'' کا نظریہ کیسے ازخود وثاقت حاصل کر لیتا ہے۔

آگے بڑھنے سے قبل، سائنس کے حوالے سے ایک خالق کے وجود کا انکار کرنے والوں کی خدمت میں چند عظیم اور متفقہ طور پر مستند مانے جانے والے سائنسدانوں کے اقوال:۔

آئن سٹائن: سائنس مذہب کے بغیر لنگڑی ہے، اور مذہب سائنس کے بغیر اندھا۔

نیوٹن: وہ خدا لافانی، قادرِ مطلق، ہمہ مقتدر اور علیم و خبیر ہے، یعنی وہ ازل سے ابد تک رہیگا۔

لوئی پاسچر: میرا علم جتنا ہے، میرا ایمان اتنا ہی زیادہ پختہ ہوجاتا ہے۔ سائنسی تعلیم کی کمی انسان کو خدا سے دور لے جاتی ہے جبکہ اس میں وسعت اور گہرائی اس کے قریب تر پہنچا دیتی ہے۔

لارڈ کیلوِن: اگر تمہاری سوچ میں قوت ہے تو سائنس تمہیں خدا پر ایمان لانے پر مجبور کر دیگی۔ [عمر بھر کی سائنسی تحقیقات کے بعد اخذ شدہ نتیجہ]

طبیعی قوانین کی کائناتی ہمہ گیریت جس کی بنیاد ایک مربوط اور متحد نظام پر رکھی ہوئی ہے، تخلیقِ کائنات کے پسِ پردہ ایک مثبت مقصدیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس لیے کہ جہاں بھی قوانین یا نظام ہوگا، وہاں ان کی پُشت پر کوئی مقصد ضرور پایا جائے گا۔ اب آیئے مقصد کی طرف۔ تو مقصد کو ایک باشعور ذات یا باشعور وجود سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی کوئی مقصد پایا جائیگا، اُس کے پیچھے ہمیشہ ایک باشعور ذات ہوگی جس نے وہ مقصد سوچا اور متعین کیا ہوگا۔ یہ حقیقت کہ کائنات قوانین پر چلتی ہے اس لیے ایک مقصد بھی رکھتی ہے، اس امر کو واضح کرتی ہے کہ کائنات کی حقیقت خواہ کچھ بھی ہو، یہ لازمی ہے کہ یہ ایک شعوری ذات یا شعوری وجود کے وصف کی مالک ہے۔ لہذا یہ مفروضہ یا دھوکا کہ کائنات کی حقیقت مادہ ہے، اب ختم ہو جانا چاہیے کیونکہ اگر مادے کو کائنات کی حقیقت گردانا جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ مادہ نہ صرف خود کا شعور رکھتا ہے، بلکہ خود کے مقصد اور نصب العین سے بھی آگاہ ہے۔ تاہم ایسا سوچنا حقیقت کے برعکس ہوگا کیونکہ مادے کی ارتقائی کارگزاری یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ مسلسل کمتر

شعوری سطحوں سے برتر شعوری مراحل کی طرف اُٹھتا ہے۔ اور یہ ہم جانتے ہیں کہ کسی جانب سے پیشگی منصوبہ بندی کیے بغیر، مادہ خود بخود بلند تر شعوری درجے کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔ اگر یہ بڑھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ کمتر سطح کے مرحلے پر رہتے ہوئے بلند تر اقدار کا شعور رکھتا ہے۔ جو کہ ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا کسی ایسے وجود کا ہونا ضروری ہے جو کہ نہ صرف شعورِ ذات رکھتا ہے بلکہ کائنات کی تخلیق کے مجموعی مقصد کا شعور بھی رکھتا ہے۔اور زندگی کے اس طویل کارواں کی قدم بہ قدم راہنمائی کر رہا ہے۔

صرف استدلال کی غرض سے اگر یہ سوچا جائے کہ، کیونکہ مادہ بھی شعور کی صفت سے متصف ہے اور اس وجہ سے مادہ اور شعور دو متوازی حقیقتیں ہیں، تو پھر بھی ہمیں اس قیاس آرائی کو براہِ راست کالعدم قرار دینا ہوگا، اس لیے کہ دو حقیقتیں پہلو بہ پہلو زندہ نہیں رہ سکتیں، کیونکہ طبیعی قوانین کی آفاقیت [universality] جو ایک واحد مقصد کی سمت اشارہ کرتی ہے، کسی ثنویت یا اجتماعیت کو تسلیم یا قبول نہیں کرسکتی۔

اُن صاحبان کے موقف کے حق میں، جو مادے کو کائنات کی اصل حقیقت مانتے ہیں، ہمارے پاس ایک اور مفروضہ باقی بچتا ہے۔ وہ یہ کہ مادہ ایک بیج کی صفت رکھتا ہے جو خود کو ایک ارتقائی عمل کے تحت نشوونما دیتا ہے۔ لیکن مادے کو ایک بیج کی حیثیت دینے میں ہمیں اس سوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ وہ کون ہے جو اس بیج کی نشوونما کر رہا ہے۔ یہ اس لیے کہ ایک بیج تو دراصل مٹی، ہوا اور پانی کے ذریعے نشوونما پاتا ہے۔ اور اسی کی مانند ایک جنین [foetus] بھی ہے جو آنول نال [umbilical cord] کے ذریعے سامانِ نشوونما پاتا ہے۔ لہٰذا، جب تک ''مادے'' کا بیج ''شعورِ مطلق'' یا ایک ''ذاتِ کامل'' کے توسط سے نشوونما نہ پا رہا ہو، مادہ کبھی بھی خود کو اپنے تئیں ارتقاء دے کر کسی بھی متعین منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں نہیں ہوسکتا، جیسا کہ ہم اسے کرتے ہوئے پاتے ہیں۔

یہ تھیوری بھی محلِ نظر ہے کہ زندگی نے اپنے تئیں، خودکار انداز میں، طبعی انتخاب [natural selection] کے طریقِ کار کے ذریعے تشکیل پائی ہے۔ یہ نظریہ صرف اُس صورت میں بامعنی کہلا سکتا تھا اگر طبعی انتخاب ایک شعوری عمل کی حیثیت رکھتا اور یہ انتخاب ایک مخصوص و متعین مقصد کے اتباع میں کیا جاتا۔ کسی مقصد کو پیشِ نظر رکھے بغیر طبعی انتخاب فقط ایک اندھا قدم اٹھانے کے مترادف ٹھہرتا ہے۔اور اس نوع کے اندھے اقدام کا انجام ماسوائے تباہی اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

یہ حقیقت کہ یہ کائنات کامیابی سے ابتدائی شعوری مراحل سے گذرتے، ترقی کرتے، بلند تر مراحل میں داخل ہو چکی ہے، اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ یہ ایک متعین منزل کی سمت میں پیش قدمی کر رہی ہے۔ پس ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کائنات نہ صرف خود میں ایک وجود رکھتی ہے بلکہ ایک تخلیق ہے اور متعین اور یقینی اصولوں اور قوانین کے تحت تخلیقی عمل سے گزر رہی ہے۔ نیز یہ کہ ان اصولوں اور قوانین کی پُشت پر ایک ایسی ہستی موجود ہے جو اپنے مقصد سے بھی آگاہ ہے اور ایک طاقتور، نادر الوجود اور قطعی منفرد حیثیت میں

خود اپنے وجود سے بھی۔ ایسا وجود جب تک خود آگاہ نہ ہو، اور اپنی صفات و ممکنات کا مکمل ادراک نہ رکھتا ہو، تخلیق نہیں کر سکتا۔ ہم ایسے وجود کو شعورِ مطلق یا ذاتِ مطلق کہہ سکتے ہیں۔

بالفاظِ دگر، یہ کائنات ایک تخلیق ہے جس میں وہ ذاتِ مطلق اپنے آئیڈیل کی نمود فرما رہا ہے جو اُس کی ذات کے اندرون میں موجود ہے اور اُس سے تقاضہ کر رہا ہے کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعے اُسے سامنے لائے۔ کیونکہ ہر تخلیق کی ایک ابتدا بھی ہوتی ہے اور انتہاء بھی، اس لیے تخلیقی طریقِ کار، سرسری نظر میں، خود کو ایک ایسے ارتقائی عمل کی شکل میں ظاہر کرتا ہے جس کے ذریعے خالق کا آئیڈیل یا مقصود خود کی نمود کر رہا ہے۔ یہ نمود انسانی حیات کی صورت جس ترقی یافتہ مرحلے تک پہنچ پائی ہے، ہنوز اپنے نقطۂ عروج سے دور ہے۔ وہ نقطۂ عروج خالق کے آئیڈیل کی صورت بارز ہونے کے لیے ایک مزید مرحلے کا منتظر ہے۔ <u>یہی وہ اگلا مرحلہ ہے جو حیات آخرت کا نام رکھتا ہے۔</u>

یہ کائنات ایک واحد اکائی کی صورت میں تخلیق کی گئی ہے۔ اس لیے ہم یہ باور کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اس کا خالق بھی واحد ہی ہے۔ کیونکہ یہ کائنات اپنی تخلیق کے کئی مراحل کے بعد اب انجامِ کار انسانی مرحلے میں داخل ہو چکی ہے، اور کیونکہ اس انسانی مرحلے میں اب تک کا عظیم ترین نقطۂ عروج، شعورِ ذات کا حصول ہے، اس لیے ہم وثوق کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ کائنات کی تخلیق کا دُور رَس مقصد انسان ہی کی تخلیق تھا۔ اس لیے دراصل انسان ہی شعورِ مطلق کا آئیڈیل ہے جسے خالق نے خود اپنے ہی اوصاف کی روشنی میں شکل دے کر اور پرورش کر کے بہت سے مراحل سے گزارتے ہوئے تیار کیا ہے۔ یہاں تک کہ انسانی مرحلے تک پہنچ کر خالق کے اوصاف انسان میں ایک روح کی شکل میں نمودار ہو گئے۔ کیونکہ جو اوصاف انسان میں روح [یا ذات] کی صورت میں نمودار ہوئے، وہ شعورِ مطلق یا ذاتِ مطلق کے اپنے اوصاف ہیں، اس لیے انسانی روح یا ذات نے اپنے اندر سے اپنے خالق کی موجودگی کا احساس و ادراک کر لیا اور اس کی عکاسی کرنی شروع کر دی۔ انسان کے اندر شعورِ مطلق کی اس عکاسی نے اسے خود آگہی یا شعورِ ذات عطا کر دی۔

لہٰذا ہم اس نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں کہ کائنات کے تمام سابقہ تخلیقی مراحل کا مطلوب و مقصود انسان کی تخلیق تھا۔ اور ۔ کیونکہ جو کچھ انسان کے تخلیقی مرحلے میں ابھر کر سامنے آیا ہے، وہ شعورِ ذات ہے، تو اس سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ ہر تخلیقی مرحلے میں، بنیادی طور پر، یہ شعور ہی تھا جو خالق کیلیے ایک طبعی کشش کی صورت اُبھرتا رہا، اور ہر مرتبہ اس کی سطح اُن شعوری اقدار کے مطابق تھی جو خالق نے ہر مرحلہ کیلیئے متعین و مختص کر دی تھی۔ اس پہلو سے نظر ڈالنے پر کائنات اُس ذاتِ مطلق کا ایک ایسا تخلیقی فن پارہ [Art] معلوم ہوتا ہے جو اپنی ترقی کے سفر کے ساتھ ساتھ، خالق کی شعوری اقدار کی عکاسی کرنے میں مصروفِ کار رہا ہے۔

انسان میں شعور کی عکاسی یہ ظاہر کرتی ہے کہ خالق دراصل کائناتی شعور کا مالک ہے۔ اس امر کا یہ کافی ثبوت ہے کہ ہر تخلیق، خواہ وہ انسانی ہو یا آسمانی، خالق کے اوصاف کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔ یہ خالق کی خواہش اور ارادہ ہے جو اسے تخلیق کی طرف اُکساتا ہے۔ اور اگر خالق اپنی تخلیق میں اپنی ذات کے تقاضوں کا اظہار نہ کر سکے، یا اگر تخلیق اپنے خالق کے اوصاف و خصائص کی عکاسی نہ کر سکے، تو تخلیق کا وقوع پذیر ہونا ناممکن ہے۔ پس ہر تخلیق، خواہ انسانی ہو یا آسمانی، اپنے خالق کے اوصاف و خصائص لازماً منعکس کرتی ہے۔

اپنے اوصاف، خوبیوں اور خصائص کے اظہار کی خواہش خالق کے اندر ایک تقاضہ پیدا کرتی ہے کہ وہ تخلیق کرے۔ دوسری طرف جوں جوں تخلیق نمو پاتی ہے، وہ خود بخود اپنے ماخذ و منبع کی سمت بڑھتی ہے، جو کہ اُس کا خالق ہے اور جس کے اوصاف پہلے ہی سے تخلیق میں منعکس ہوتے ہیں۔ یہ امر خود کار طرز پر تخلیق کے اندر یہ تقاضا پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنے خالق کی جستجو کرے اور اس سے پیار کرے۔ کائنات کے تناظر میں یہ حقیقت اس صورت میں سامنے آتی ہے کہ جوں جوں یہ اپنے تئیں خالق کے اوصاف کی جھلک پاتی ہے، یہ سخت جدوجہد کرتی ہے کہ خالق کو ایک حقیقی پیکر دے کر بارز کر سکے۔ تخلیق اپنے تمام تر وجود کے لیے خالق کی مقروض ہوتی ہے، اس لیے اس کی حقیقی خوشیاں خالق کی جستجو میں سرگرداں رہنے اور اس سے محبت کرنے میں پنہاں ہوتی ہیں۔ جو کچھ بھی تخلیق ہوتا ہے وہ خالق کی اپنی ذات کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسری طرف تخلیق بھی خالق کی خواہش کے نتیجے میں بن سنور کر وجود میں آتی ہے جس میں خالق کی روح تیرتی ہے اور تخلیق کو زندگی بخشتی ہے۔ وہ زندگی جس کا ارتکاز اپنے ماخذ یعنی خالق کی سمت ہوتا ہے۔

قارئینِ محترم، اگر خالق و مخلوق کے درمیان موجود ناقابلِ تردید روحانی رشتے اور لازوال محبت کے اَن مِٹ بندھن کے ضمن میں درجِ بالا منطقی بحث کسی قدر ناقابلِ قبول محسوس ہو تو آیئے اس کو سمیٹتے ہوئے، اس کی تائید و تصدیقِ مزید کے لیے علامہ اقبال کے افکارِ عالی سے مدد حاصل کرتے ہیں۔ علامہ صاحب جب مومن کا لقب استعمال کرتے ہوئے ایک انسانِ کامل کے اوصافِ حمیدہ، صفاتِ خالق کے پُر زور تناظر میں بیان فرماتے ہیں، تو عمیق نظر رکھنے والے سمجھ جاتے ہیں کہ اقبال کی نگاہِ جہاں بیں حقیقتِ مطلق کی اُن گہرائیوں تک پہنچ چکی تھی جن کا بیان آپ نے اوپر کی سطور میں نوٹ فرمایا۔ وہ بے شک ''محرمِ رازِ درونِ مے خانہ'' تھے اور معانی کے اِک سمندر کو چند اشعار کے کوزے میں بند کرتے اور ایک خوبصورت اتمامِ حجت کی راہ ہموار کر دیتے تھے۔ ملاحظہ فرمایئے:۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کار کشا و کارساز

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اُس کا دلِ بے نیاز

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے
جنہیں بخشا ہے تُو نے ذوقِ خدائی

دونیم ان کی ٹھوکر سے دریا و صحرا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

توانائی[energy]اور شعورِ مطلق

تیرا جوہر ہے نوری پاک ہے تُو　　　　فروغِ دیدہِ افلاک ہے تُو

آیئے قارئین، مادے،،،،،نیچرل سیلیکشن ،،،،اور خود کار ارتقاء،،،، کے نظریات سے نبرد آزما ہونے کے بعد، اب توانائی کی حقیقت پر بھی فزکس کی روشنی میں ایک سیر حاصل تحقیق کر لیتے ہیں، تا کہ خالق کے وجود اور نتیجتاً حیاتِ آخرت کے اثبات کے سلسلے میں اذہان میں کوئی بھی پھانس چبھی نہ رہ جائے۔ یہ امر یہاں غالباً دہرانے کی ضرورت نہیں کہ حیاتِ آخرت کا نظریہ لازماً ایک شعورِ مطلق کی مالک ہستی کے وجود سے جڑا ہے جو توانائی کی مانند غیر مادی وجود رکھتا ہے اور جو تمام تر سلسلہِ تخلیق کا پلانر اور خالق ہے۔

جیسا کہ ما قبل کے عنوانات کے تحت ذکر کیا گیا کہ اب سائنس کی دنیا میں یہ عمومی یقین رائج ہو چکا ہے کہ کائنات کی حقیقت توانائی ہے۔قبل ازیں یہ خالص مادہ باور کی جاتی رہی ہے۔ اس تبدیلی کیوجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اگر چہ مادہ توانائی کی شکل اختیار کر سکتا ہے اور اسی کے مانند توانائی مادے میں تبدیل ہو سکتی ہے، اس کے باوجود مادے کوئی شکل ایسی نہیں جس میں توانائی موجود نہیں۔ اسی لیے توانائی کائنات کی حقیقت اور نچوڑ ہے۔ تمام خوبصورتی اور کشش جو اس کائنات میں موجود ہے، دن کی روشنی اور رات کا اندھیرا، تمام رنگ اور ان کے مختلف شیڈ اور مادے کی تمام کیفیات، کائنات کے بالکل ابتدا سے لے کر انسان کے دانش مند مرحلے تک، سب توانائی کے مظاہر ہیں۔ حتٰی کہ انسان کی خود آگاہ حیات، توانائی کی ارتقاء یافتہ شکل ہے۔ دانائے راز کے الفاظ میں:۔

تیرا جوہر ہے نوری پاک ہے تُو　　　　فروغِ دیدہِ افلاک ہے تُو
تیرے صیدِ زبوں افرشتہ وحور　　　　کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تُو

ہم بہت سی ایسی اشکال کا علم رکھتے ہیں جن میں توانائی مختلف انداز میں استعمال ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر فزکس کے قوانین کے مطابق آواز فضاء میں مختلف لہریں پیدا کرتی ہے۔ یہ لہریں اگر ایک مقناطیسی فیتے[magnetic tape] پر محفوظ کر لی جائیں تو یہ دوبارہ آواز کی شکل میں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ حیاتیاتی[biological] مراحل میں توانائی خود کو انتہائی پیچیدہ شکل میں ظاہر کرتی ہے۔ اگر ہم ایک لکڑی کا ٹکڑا جلائیں تو لکڑی میں مستور توانائی خود کو کاربن، حرارت اور روشنی کی اشکال میں ظاہر کرے گی۔ حتٰی کہ اس کی باقیات، راکھ، فضاء میں چھوٹے ذرات کی شکل میں غائب ہو جائیں گے۔ اس طرح لکڑی جو توانائی کی ایک مستور شکل تھی، جلنے کے بعد توانائی کی کئی اشکال میں تبدیل ہو گئی۔

تاہم، ہم توانائی کو کائنات کی حقیقت کے طور پر، اس نہایت سادہ سی بنیاد پر، قبول نہیں کر سکتے کہ یہ کبھی بھی استحکام نہیں

رکھتی۔کوئی بھی چیز جو اپنے آپ میں مستحکم نہ ہو، نہ ہی خالق ہو سکتی ہے اور نہ ہی کائنات کی اصل وحقیقت۔ اسی بنیادی اصول، بلکہ بنیادی سقم کی روشنی میں کچھ فلاسفروں اور مفکرین نے یہ موقف اختیار کر ڈالا کہ توانائی کی پُشت پر ایک اور قسم کی توانائی ہے جو، ان کے مطابق، کائنات کی حقیقت ہے۔ اس کو یہ "مستحکم توانائی" کا نام دیتے ہیں۔

بظاہر یہ قیاس متاثر کُن معلوم ہوتا ہے کیونکہ حرکت پذیری جو عام توانائی کی بنیادی خصوصیت ہے، تبدیلی کے عمل سے گذرتی رہتی ہے اور جو چیز بھی تبدیلی کا ہدف ہو، خالق نہیں ہو سکتی۔ اس لیے "مستحکم توانائی" ہی کائنات کی حقیقت ہو سکتی ہے جو اس کائنات کو تعمیر کرتی اور اس کی صورت گری کرتی ہے۔

تاہم جب ہم کائنات کے تخلیقی طریقِ کار کی طرف دیکھتے ہیں تو ہمیں علم ہوتا ہے کہ کائنات تو سلسلہ وار تدریجی مراحل میں تخلیق کی گئی ہے۔ اور وہ بنیادی خصائص جو ان مراحل کو ایک دوسرے سے ممیّز کرتے ہیں وہ کم تر یا بلند تر شعوری اقدار ہیں۔ اس لیے جب تک بلند تر متعین منزلوں کے حصول کے لیے توانائی کی پُشت پر ایک ذہن یا شعور کارفرما نہ ہو، توانائی کی کوئی بھی شکل، خواہ عمومی ہو یا مستحکم، بغیر کسی پیشگی تفہیم وتعیین کے، خود بخود کم تر شعوری مراحل سے بلند تر شعوری مراحل تک منتقل نہیں ہو سکتی۔ یعنی کائنات کے مادی مراحل سے آگے بڑھتے ہوئے انسان کے شعورِ ذات کے مرحلے تک۔ مزید یہ کہ توانائی، خواہ عمومی ہو یا مستحکم، کائنات کے حاضر وجود کی وضاحت وتشریح نہیں کر سکتی۔ مادے کی تمام شکلیں، کاسموس کے جیومیٹریکل اوصاف، فزیکل قوانین کا ہم آہنگ تسلسل، زندگی میں کشش اور تقاضے، ایسی خصوصیات ہیں جو محض جھٹکوں [jolts] یا حرکت پذیری [motion] سے نمودار نہیں ہو سکتے۔

لہذا ہمارے پاس یہ یقین کرنے کے لیے کافی دانش موجود ہے کہ جب تک تحرک اور رفتار ایک ایسی طاقتور ہستی کے ذریعے راہنمائی اور کنٹرول نہیں کیے جاتے، ایک ایسی ہستی جو ستاروں کے جھلملانے، بادلوں کے گرجنے، دریاؤں اور نہروں کے بہنے، پھولوں کے کھلنے اور زندگی میں وہ تقاضہ پیدا کر سکنے کی قوتوں کی مالک ہو کہ وہ تمام تر شان وشوکت کیساتھ خود کی نمود واظہار کر سکے، اوپر بیان کی گئی کوئی بھی اقدار وجود میں نہیں آ سکتیں۔مزید برآں، وہ تمام خوبیاں جو ایک نئی شکل میں انسان میں ظاہر ہوتی ہیں جیسے کہ ایمان، محبت، عزتِ نفس، ارادہ اور شعورِ ذات، وغیرہ، واضح طور پر اشارہ دیتی ہیں کہ توانائی، طبیعیات کے ماہرین کے نظریات کے علی الرغم، اس حیرت انگیز کائنات کی حقیقت نہیں ہو سکتی۔

کائنات کی حقیقت صرف کوئی ایسی ہستی یا ایسا وجود ہی ہو سکتا ہے جو خود آگاہ ہو اور ایسے اوصاف کا مالک ہو جس نوعیت کے اوصاف خود انسان کے اندر سے ظاہر ہوتے ہیں۔بصورتِ دیگر، ہم نہ ہی انسان کے اندر موجود ارادے اور عزم کی خصوصیات کی وضاحت وتشریح کر سکتے ہیں اور نہ ہی حیات کے باطن میں عمومی طور پر موجود محبت اور کشش کے عناصر کی وضاحت کر سکتے ہیں جو کائنات

کے تمام تر تخلیق شدہ مراحل میں آشکار ہے۔

توانائی دراصل کیا چیز ہے۔

اسی بناء پر ہم یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ توانائی دراصل اُس جذبہِ کشش کی قوت ہے جو زندگی یا شعور کی اندرونی صفات میں سے ایک ہے۔ بالفاظ دیگر، توانائی شعور سے آزاد کوئی وجود نہیں رکھتی۔ جہاں کہیں بھی توانائی ہے وہاں شعور بھی موجود ہوتا ہے۔

توانائی کی تمام اکائیاں زندہ اور شعور رکھنے والی ہیں لیکن اپنے اپنے تخلیقی مرحلے یا سطح کی حدود میں مقید ہیں۔ آفاقی مرحلے میں یہ اکائیاں مادی اجسام کی شکل میں زندہ تھیں۔ حیاتیاتی مراحل میں زندگی کی یہ اکائیاں یا توانائی، نباتات اور حیوانات کے اجسام میں زندہ تھیں۔ اور انسانی مرحلہِ زندگی میں یہ اکائیاں انسانی شعور یا انسانی ذات کی شکل میں نمودار ہوئیں۔ ہم توانائی کو شعورِ مطلق کی شعوری یا تخلیقی قوت کا نام بھی دے سکتے ہیں، جو ہر تخلیقی عمل میں اپنی مرضی و ارادہ ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے ہر حرکت پذیری یا پیش قدمی دراصل ایک عمل کے قالب میں ڈھالی گئی سوچ، یا شعوری اقدام ہے۔

شعورِ مطلق اپنی ذات اور اوصاف میں یگانہ ہونے کی حیثیت میں اپنے حسن اور سحر کو ایک مثالی پیکر کو صورت میں تصور کرتا اور اسے حقیقت کا روپ دینے کی خواہش رکھتا ہے۔ جب تک وہ اسے حقیقت کی شکل نہیں دے دیتا، وہ مثالیہ جو خالق کے ذہن میں پنپتا رہتا ہے، وہ اُس کے باطن سے اسے تخلیق کے لیے ابھارتا اور مائل کرتا رہتا ہے۔ اس طرح تخلیق کی پُشت پر جو حقیقی تقاضہ ہے وہ دراصل آئیڈیل [ایک قابلِ ستائش تصوراتی پیکر] کے لیے شدید محبت اور کشش ہے جو اُبھرتی ہے تو حرکت کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ بالفاظ دگر، ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ وہ تقاضہ جو "فطرت" کے اندر زندہ ہے، جب آئیڈیل کی کشش کے ذریعے توانائی پاتا ہے تو مادے کی علامت میں حرکت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس لیے توانائی کچھ اور نہیں بلکہ کشش پر مبنی ایک برقی کرنٹ ہے۔ اس کی ہر حرکت اپنے ساتھ خالق کے مثالی پیکر کے اوصاف لے کر پیدا ہوتی ہے۔ تحرک [motion] نہ تو اپنا خود مختار وجود رکھتا ہے اور نہ ہی یہ اپنی نوعیت میں خودکار ہے۔ یہ دراصل شعور کی کاروائی ہے جس کے ذریعے وہ اپنے اوصاف و خصوصیات کو مشہود کرتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو ثابت ہوگا کہ تمام عملی کاروائیوں کا سرچشمہ درحقیقت شعورِ مطلق ہے۔

ہم تحرک [motion] اور مادے [matter] کو دیکھ سکتے ہیں لیکن توانائی کو نہیں۔ کیونکہ توانائی غیر مادی ہے اور حسیات اس کو محسوس نہیں کر سکتیں۔ ہم تحرک اور توانائی کی خصوصیات کو کائنات کے طبیعی اور حیاتیاتی [biological] مراحل میں ان کے طریقِ کار کا مطالعہ کر کے سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے توانائی اور تحرک کے جدید نظریے مبہم اور گمراہ کُن ہیں۔ یہ قیاسات اور ابہام پر مبنی ہیں۔ طبیعیات دان توانائی کی تعریف،،،،،" ایک ایسی چیز جو کام کرتی ہے " ،،،، کہ کر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک قطعی مبہم تعریف ہے جو ادراکِ حقیقت تک نہ پہنچ پانے پر اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہے۔ کیونکہ کام صرف اُس کام کو کہا جا سکتا ہے

جو کسی پسندیدہ اور متعین شدہ مقصد کے حصول کے لیے کیا جائے۔ بالفاظِ دگر، کسی بھی حرکت کے پسِ منظر میں کوئی مقصد یا محرک ضرور ہونا چاہیئے۔

کائنات کی تخلیق کے مراحل۔

ہمارے نظریے کی سیر حاصل تعریف کرنے کے لیے ہمیں کائنات کی تخلیق کے مختلف مراحل کو، اور ہر مرحلے میں توانائی کی شکل اور اس کی حرکت پذیری کو متعلقہ مرحلے کی شعوری سطح کو مدّ نظر رکھتے ہوئے زیرِ تحقیق لانا ہوگا۔ اگر چہ کہ کائنات ایک واحد اکائی کی صورت میں زندہ ہے پھر بھی جب اس کے بہت سے طریقِ کار سنجیدگی کے ساتھ زیرِ غور لائے جاتے ہیں تو ہمیں علم ہوتا ہے کہ جو کچھ بھی مختلف، خودکار، کردگاہوں کی شکل میں تخلیق کیا گیا ہے وہ زندگی یا شعور ہی ہے۔ یہ خودکار سسٹم یا مراحل ہیں:۔ ١] فلکیاتی مرحلہ ٢] زمینی مرحلہ ٣] نباتاتی مرحلہ ٤] حیوانی مرحلہ اور ٥] آخرِ کار انسانی شعورِ ذات کا مرحلہ،،،، جو کہ کائنات کا اب تک معلوم سب سے اہم اور بلند ترین شعوری مرحلہ ہے۔ چھٹا اور آئندہ مرحلہ کیونکہ خالص غیر مادی، شعوری مرحلہ ہے اور موجودہ مرحلہِ حیات سے بلند تر درجہ کا حامل ہے، اور حیاتِ آخرت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اس لیے ہم اپنی موجودہ سطح پر رہتے ہوئے، تخلیقی مراحل کے مکمل سیاق و سباق میں، اس مرحلے کے بارے میں صرف حتی المقدور تحقیق ہی کر سکتے ہیں۔ اُس کی مکمل آگہی اِس مرحلہ میں رہتے ہوئے ممکن نہیں۔

آیئے یہاں ہم سب سے قبل انسانی خود آگاہ یا شعورِ ذات کے مرحلے کو زیرِ بحث لاتے ہیں جو کائنات کا سب سے اہم اور بلند ترین شعوری مرحلہ ہے۔ اس مقصد کے لیے ہم ان مادی اشکال یا اجسام پر سرسری نظر ڈالیں گے جو انسان نے دنیا میں ہر جگہ انسانی مرحلے پر اپنے نمودار ہونے کے بعد تعمیر کی ہیں۔ ہم بڑی بڑی عمارتیں دیکھتے ہیں، سڑکوں کے جال، فیکٹریاں، موٹر گاڑیاں، فرنیچر، کپڑے اور ساز و سامان کی ناتمام اقسام دیکھتے ہیں۔ یہ تمام اشیاء حرکت کے نتیجے میں بنائی گئی ہیں۔ حرکت کا وسیلہ یعنی آلات [tools] جو انسان نے استعمال کیے، بہت سے ہیں اور مختلف نوعیت رکھتے ہیں۔ ان آلات کو ہم تفہیم کی آسانی کے لیے تین گروپوں یا درجوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلی قسم میں طبیعی طور پر ماقبل سے وضع شدہ وہ آلات ہیں جو انسانی جسم اپنے ساتھ لاتا ہے، جیسے کہ ٹانگیں، ہاتھ، پیر وغیرہ۔ دوسری قسم میں وہ آلات ہیں جو زندگی کے حیوانی مرحلے سے تعلق رکھتے ہیں جیسے کہ پالتو حیوانات۔ تیسری قسم میں وہ آلات ہیں جو انسانی ذہانت نے مادے کی بے شمار زندہ اشکال سے تخلیق کیے ہیں جیسے کہ پودے، معدنیات اور عناصر بشمول پانی، گیس، بجلی وغیرہ۔ ان آلات کے گروپ کو ہم میکینیکل آلات کہ سکتے ہیں جیسے کہ ہتھوڑا، درانتی، کرینیں، موٹر گاڑیاں، بُل ڈوزرز، جنریٹرز اور مختلف قسم کی مشینیں۔ یہ تمام آلات انسانی ذہانت یا انسان کی شعوری ذات استعمال اور کنٹرول کرتی ہے تاکہ متعین مقاصد حاصل کر سکے۔

ایک چیز جو مشترک طور پر ان تمام آلات میں پائی جاتی ہے اور جس نے ان آلات و اوزار کے استعمال کو ممکن بنایا ہے وہ حرکت [motion] ہے۔ حرکت خواہ میکانیکی ہو یا طبیعی، یہ سست ہو یا سریع، تمام اشکال جو انسان نے زمین پر وضع کی ہیں حرکت ہی کا نتیجہ ہیں۔ تاہم حرکت ان آلات کے بغیر ناممکن ہے۔ اور ان آلات کی حرکت، خواہ وہ ہاتھوں کی حرکت ہو یا مشینوں کی، اُس خاص

مقصد کے بنا کوئی وجود نہیں رکھتی جو انسانی ذہن نے یا انسان کی شعوری ذات نے حاصل کرنے کی خواہش یا تقاضہ کیا ہو۔

مشینوں کی تیاری میں بھی یہ انسانی شعور ہی ہے جو مشینوں کی شکل میں عمل پذیر ہوتا ہے۔ حرکت کے وسیلے یا آلات کی حیثیت میں مشین اُس انسانی شعور کی سوچ کے بغیر وجود میں ہی نہیں آسکتی تھی جس نے اسے تخلیق کیا ہے۔اب، جیسا کہ ہمارے سامنے عیاں ہے، بنیادی طور پر حرکت کی خصوصیت وہی ہے، لیکن حرکت کا ذریعہ یعنی آلات، بہت سی شکلیں رکھتے ہیں۔ ان آلات میں سے ہر ایک کی حرکت کے اندر انسانی شعوری ذات کا مقصد کارفرما ہوتا ہے جو اپنا عمل جاری رکھتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، یہ آلات انسانی ہاتھ اور پیر کے اضافی اعضاء ہیں جن کے ذریعے انسانی ذہن اور شعور مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے عمل پیرا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے پین یا پنسل جیسے آلات، ہاتھ جیسے آلات کی حرکت کا اتباع یا پیروی کرتے ہیں، اور یہ دونوں نوعیت کے آلات انسانی شعور کے ذریعے کنٹرول اور استعمال ہوتے ہیں جو انہیں متعین مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح آلات کی تمام دوسری اشکال بھی دراصل انسانی جسم کے ہاتھوں کے اضافی اعضاء ہیں جن کے ذریعے انسانی شعور اپنا کام کرتا ہے۔اگر ہم انسانی عقل یا شعوری ذات کو اس سے الگ کر دیں، تو ہم دیکھیں گے کہ دنیا میں موجود تمام انسانی بنائی اشکال بھی غائب ہو جائیں گی۔ اور ان کے ساتھ ہی وہ آلات بھی جو انسانی ذات نے تخلیق کیے ہیں۔

پَس ثابت ہوا کہ یہ دراصل انسانی شعور ہی ہے جو حرکت کو پیدا کرتا ہے اور لہٰذا ان آلات کو انسانی شعور ہی توانائی فراہم کرتا ہے جب اور جہاں تک یہ زندہ اور باشعور ہیں۔ بصورتِ دیگر آلات اور توانائی کی یہ شکلیں اپنا وجود ہی قائم نہیں رکھ سکتیں۔

توانائی اور حرکت کے بارے میں ابہام اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے سائنس دان اور ماہرِ طبیعیات اشیاء کو جزوی طور پر علیحدہ علیحدہ دیکھنے کے عادی ہیں، یعنی مجموعی مقصد پر غور کیے بغیر۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہم کائنات کو ایک سالمہ کی حیثیت سے لیتے ہوئے حرکت کی اصل کو اُن آلات کے تناظر میں، جن کے ذریعے یہ کام کرتی ہے، بہتر انداز میں سمجھ سکتے ہیں۔

جیسے کہ اوپر وضاحت کی گئی، حرکت یا اس ضمن میں اس کا کوئی بھی آلہ کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک کہ ایک خاص طریقِ کار کی پیروی نہ کرتا ہو جو اُس عظیم تر مقصد یا شعور نے متعین کیا ہو جو کائنات کو تدریجی مراحل میں تخلیق کر رہا ہے۔ کائنات کے ہر تخلیقی مرحلہ میں آلاتِ حرکت کی ایسی لاتعداد اشکال ہو سکتی ہیں جنہیں مجموعی مقصد نے زندگی دی یا توانائی بخشی ہو۔ اور اسی طرح حرکت کے بھی ایسے لاتعداد انداز ہو سکتے ہیں جو ہر مرحلۂ تخلیق پر حاصل کی گئی شعوری اقدار کی استعداد یا سطح کے مطابق ہوں۔ بالفاظِ دیگر ان آلات کی تمام انواع کے باوجود کائنات میں سرایت کی ہوئی بنیادی توانائی صرف ایک ہی ہے اور وہ توانائی میکینیکل نہیں، جیسے کہ فزکس کے ماہرین عموماً دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ ایک زندہ اور باشعور توانائی ہے جو اپنی ذات سے آگاہ بھی ہے اور اپنے مقصد سے بھی۔

مثال کے طور پر آیئے ہم کائنات کے پہلے تنظیمی مرحلے کو سامنے رکھتے ہیں۔ یہاں آلہِ حرکت " فوٹون" کا ذرہ ہے اور اس کی حرکت روشنی کی رفتار ہے۔ فوٹون کو شعورِ مطلق نے اپنے آئیڈیل کے ظہور و نمود کے لیے تخلیق فرمایا۔ فوٹون جب تک شعورِ مطلق یا خالق کے ارادے کی تکمیل کرتا ہے، یہ زندہ ہے۔ مادے کی تمام مختلف النوع اشکال اور ان کے درجات نے، جو کاسمک [cosmic] مرحلے میں تخلیق کیے گئے اور جنہیں فزکس دان توانائی کی مختلف صورتوں کا نام دیتے ہیں، اس حرکت کا اتباع کیا جس کا تقرر خالق نے کاسمک مرحلے کے متعین مقصد کے حصول کے لیے کیا تھا۔ لہذا حرکت اور اس کے آلات جیسے کہ ذیلی ایٹمی ذرات، ذرات، ایٹم، وغیرہ جن کے ذریعے حرکت نے خود کو، جزوی طور پر ذرات کے ٹکراؤ کے ذریعے اور جزوی طور پر ذرات کے مابین واقع تعلق اور کیفیات اور باہمی کشش کے ذریعے، جاری رکھا ان کا تعین زندگی کے کاسمک پلان کی مجموعی شعوری اقدار نے کیا تھا۔ جب کاسمک مرحلہ اپنی تکمیل کے نکتے پر پہنچا تو حرکت کے تمام انداز اور اس کے آلات یعنی ذرات، مختلف عناصر کے ایٹم، اور ان کے عظیم کائناتی اجسام کی شکل میں، منظم و مربوط ڈھانچے بن کر، مستقل طور پر اپنی ہیئت پر قائم ہو گئے۔ کاسمک مرحلے کا تمام تر مقصد عناصر کی مختلف اشکال کی تخلیق تھا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہر عنصر کاسمک مرحلے میں خالق کے تخلیقی عمل یا طریق کار سے تشکیل پایا گیا ایک فن پارہ تھا۔ یہ عناصر دراصل کاسمک مرحلے کا نچوڑ یا ماحصل ہیں جو حرکت کی ان تمام خصوصیات کے حامل ہیں جو ایک عظیم منصوبے نے متعین کی تھیں۔

تخلیق کا بنیادی قانون ہمیں بتاتا ہے کہ ہر مرحلے کی تکمیل پر جو بھی شعوری اقدار یا سسٹم جو پلان کے تحت حاصل کر لیے گئے انہوں نے مستقلاً اپنی جگہ قائم رہنا تھا۔ اگر طبیعیات دان کچھ خاص عناصر کے ایٹمز کے خودکار عمل کو بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں تو انہیں ایٹم کی غیر ترقی یافتہ یا ناپختہ [crude] شعوری سطح کے مطابق ایک طبعی ردِّعمل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ طبیعیات دان ایٹم کے اندر موجود عظیم ہنرمندی اور فن کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور اس کی بجائے وہ اس خام خیالی پر خوشی مناتے ہیں کہ یہ ایٹم انسانوں اور ان کے کارناموں کو تباہ کر سکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، ان کے سامنے توانائی کا تصور میکینیکل اور crude حرکت ہے جو کسی مقصد یا شعور سے عاری ہے۔ طبیعیات دان ایٹم کی اس خوفناک حرکت کو توانائی کا نام دیتے ہیں۔ جیسا کہ کہا گیا، انسان بھول جاتا ہے کہ ایٹم کا یہ آلہ [tool] تخلیق کرنے میں فطرت نے حیرت انگیز کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ لیکن یہ انسان ہے جس نے ایٹم کو ایک تباہی کے آلے میں تبدیل کر دیا ہے۔ پھر بھی اگر انسان ان ایٹموں کی خصوصیات کو سدھا کر تعمیری مقاصد میں استعمال کرے، ان کی زندگی تباہ کیے بغیر، تو یہ خوف کا ماخذ زندگی بچانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

درحقیقت کائناتی مرحلے میں توانائی کی تخلیق شدہ مختلف اشکال کی خصوصیات کو ترتیب دے کر، ہم آہنگ کر کے، سکون

پذیر کرکے، بالآخر اُن عناصر کے خول کے اندر اُتار دیا گیا ہے جو کائنات کی ابتدائی یا بنیادی اینٹوں کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ اسی لیے اگلے خود مختار مرحلے، یعنی سیارۂ زمین کے مرحلے کے اندر ہم ان عناصر کو پہلے سے تیار شکل میں پاتے ہیں اور ہمیں یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ ماقبل میں کبھی مختلف شکل رکھتے تھے۔ کاسموس کے پہلے تخلیقی مرحلے کی تکمیل پر دوسرا بلند تر شعوری منصوبہ سیارۂ زمین پر بطور ایک علیحدہ خودکار سسٹم شروع ہوا۔ اس بلند تر شعوری منصوبے کے تحت سیارۂ زمین نے ماقبل میں تعمیر شدہ عناصر کو کام کے آلات کی طرح استعمال کرتے ہوئے حرکت کا طریقِ کار مزید متعین کیا۔ عناصر کی حرکت یا طریقِ کار جو اس طرح متعین ہوا اسے ہم طبیعی قوانین کہتے ہیں۔ شروع شروع میں یہ طبیعی قوانین الٹتے پلٹتے اور تبدیل ہوتے رہے، یہاں تک کہ یہ ایک مکمل واحد نظم کی صورت ہم آہنگ ہو گئے۔ زمین کے اپنے شعوری لیول کے تحت اس کی تمام طبیعی تشکیل، اس شعوری سطح کی نمود تھی جو زمین نے مختلف مادوں اور ان کے باہم اختلاط کے ذریعے، یا توانائی کی ان صورتوں کو، جو زمین نے خود متعین کی تھیں، حرکت [motion] کے آلات کے طور پر استعمال کر کے حاصل کی۔ ان میں وادیوں کی بلندیاں اور پستیاں، مسلسل تبدیل ہوتے موسم، پانی کی روانی، میدان، سمندر، دریا وغیرہ شامل ہیں، سب کی بنیاد اس حرکت کے انداز پر رکھی گئی جو ہم آہنگی اور شراکتِ کار کی پیدا کردہ تھی، جو کہ صرف اور صرف شعور کی صفات ہیں۔ ایک کامل نظم کی صورت میں تکمیل پر یہ قوانین اپنی جگہ اٹل ہو گئے اور اسی لیے یہ حرکت کے اس طریق سے روگردانی نہ کر سکتے تھے جو سیارۂ زمین نے ایک زندہ اکائی کی حیثیت میں اپنی مجموعی شعوری اقدار کے تحت متعین کی تھی۔ یہاں بھی کیمیاوی مادوں اور ان کے اختلاط کے نتیجے میں لاتعداد اشکال جو سیارۂ زمین نے آلاتِ حرکت یا عمل کی شکل میں باہم منظّم کی تھیں، اس مرحلے کی تکمیل کے بعد نہ کبھی تباہ ہو سکتی تھیں اور نہ پھر تخلیق۔

اگلا بلند تر تخلیقی پلان، یعنی نباتاتی حیات، طبیعی قوانین کے اٹل ہو جانے کے بعد ایک علیحدہ، اپنے دائرۂ کار میں بند سسٹم کی حیثیت سے شروع ہوا۔ اس مرحلے میں حرکت کا مخصوص انداز اور اس کے اپنے آلات جو نباتاتی اجسام نے ہم آہنگ کر کے ایک وجودی اکائی کی شکل میں مربوط کیے، سابقہ تخلیقی مراحل سے مختلف تھے، کیونکہ نباتات کی شعوری سطح ان مراحل سے بلند تر تھی۔ تاہم کیونکہ نباتاتی مرحلے میں حیات ابھی خود سے آگاہ نہ تھی لہٰذا اس نے اپنی شعوری اقدار کو طبیعی قوانین کے تناظر میں ایک مختلف ردِ عمل پیدا کرتے ہوئے زندہ اجسام کے ماڈل کے طور پر پیش کیا اور اپنی حرکت پذیری کے انداز کو اپنی نئی شعوری اقدار کے مطابق کنٹرول اور استعمال کیا۔ اسطرح اس نے پتوں کی درست تناسب میں لائنیں اور خطوط، شکلیں اور ہیئتیں اور رنگوں کے متناسب شیڈز اور پھولوں کی شکلیں اور خوشبوئیں وغیرہ متعارف کرائیں۔ حیات کے نباتاتی مرحلے کی سرگرمیاں اور حرکت پذیری نے پودوں کی شعوری اقدار کی سطح پر ردِّ عمل ظاہر کیا، جس نے خود مکتفی اجسام کی طرح اس مرحلے میں اپنی شعوری اقدار کے تعین کے لیے کام کیا۔ یہاں بھی پودوں کے اجسام میں

موروثی طور پر موجود میکینزم نے آلات کا کام کیا اور ہر پودے نے اپنی شعوری سطح کے مطابق حرکت کا انداز اپنایا۔

نباتاتی مرحلے کے تکمیل پا جانے کے بعد حیات حیوانی مرحلے میں داخل ہوئی۔ یہاں پھر ایک بار اپنے بلند تر جبلی پلان کے مطابق ہر حیوان نے اپنے طبیعی آلات تعمیر کیے، مثلاً اعضاء، ٹانگیں، آنکھیں، جبڑے، پنجے وغیرہ جو کہ حیات کی اس مخصوص شعوری سطح کے عین مطابق تھے۔ حیوانات نے ان آلات اور ان کی حرکت کو کنٹرول کیا حتّٰی کہ وہ آلات جو ان کے جسم کے اندر واقع تھے، مثلاً دل، پھیپھڑے، گردے، معدہ وغیرہ، وہ بھی حیوانی زندگی کے مجموعی مقاصد کے مطابق باہمی ربط کے ساتھ اور کنٹرول کے تحت حرکت پذیر ہوئے۔

اس طرح اجسام کے آلات اور ان کی حرکات ہر تخلیقی پلان کے مجموعی مقصد نے متعین کیے، اور یہ سب تخلیقی پلان مزید ایک مجموعی مقصدِ واحد نے متعین کیے جو تمام کائنات کی وسعتوں میں ایک متحدہ نظم یا متحدہ پلان کی حیثیت میں سرایت کیا ہوا تھا۔ فزکس دان اس واحد یا متحد توانائی کے نظام کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو توانائی کی اُن تمام اشکال کو کنٹرول کرتا ہے جو کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ تاہم وہ افسوسناک طریقے پر اِس حقیقت سے لاعلم ہیں کہ توانائی کی خصوصیات یا حقیقت میکانیکی نہیں۔ اس کی حقیقت شعور [consciousness] ہے۔ لہٰذا کائنات کی وہ واحد کنٹرول کرنے والی مربوط توانائی کوئی اور نہیں بلکہ شعورِ مطلق یا وجودِ مطلق ہے۔ اور یہ اُسی کا سوچا سمجھا مقصد یا اس کے شعور کی کاروائی ہے جس نے تمام تخلیق کو مقصدیت دی۔ یہ کوئی موروثی خاصیت رکھنے والی یا میکانیکی توانائی نہیں ہے جیسا کہ یہ فزکس دان سمجھتے ہیں۔

بالفاظِ دیگر جسے ہم توانائی کہتے ہیں یہ دراصل شعورِ مطلق کا شعوری ارادہ یا مقصد ہے جو ان چارجڈ [charged] یا برقیائے ہوئے ذرات کی شکل میں نمودار ہوا جن کی حرکت روشنی کی رفتار تھی۔ جوں جوں تخلیق نے قدم بہ قدم پیش قدمی کی، اپنے دائروں میں بند خود مختار نظاموں یا تخلیقی مراحل کی شکل میں، حیات یا شعور اپنے خالق کے لیے ایک ردّ عمل کے برقیے یا کشش کے ابھار کی صورت میں نمودار ہوا جو اپنے خالق کے لیے محبت اور کشش کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی تمام خصوصیات اور اوصاف خالق کے ودیعت کردہ ہیں۔ حیوانی مرحلے تک زندگی نے خود آگہی حاصل نہیں کی تھی اس لیے آلات و اوزار جو حیات کی اُس شکل نے استعمال کیے فطرت نے ترتیب دیے تھے، اور جو نتائج حاصل کیے جانے تھے وہ خالق نے خواہش کی تھی۔ پھر بھی حیات نے ان مراحل تک، جس پیمانے پر بھی وہ اپنے خالق کا احساس کر پاتی تھی، خود اپنے ارادے سے جدوجہد اور تعاون کیا۔ انسانی مرحلے پر حیات اپنے خالق سے براہِ راست آگاہ ہوگئی اور خود اپنی ذات سے بھی۔ یہاں انسان نے اپنی عظیم تر اور آفاقی روشنی میں عالمی آزادی سے لطف اُٹھایا۔ لہٰذا انسان ان نتائج کے حصول میں جو خالق نے متعین کیے ہیں فزوں تر حصہ لیتا ہے۔ اسی لیے وہ ساز و سامان جو انسان نے بنایا ہے، موروثی جسمانی آلات تک

محدود نہیں ہے جیسا کہ زندگی نے حیوانی مرحلے تک پیدا کیا تھا۔ انسان نے تو اپنے لامحدود اور تشنہ شعوری تقاضوں کو پورا اظہار دینے کے لیے مصنوعی آلات تعمیر کر لیے۔ مصنوعی اور فطری آلات کے فوائد اور نقصانات کچھ ایسا باہمی توازن رکھتے ہیں کہ ان کے طریقِ کار میں فرق کرنا مشکل ہے۔ حیوانی مرحلے اور ماقبل میں حرکت کے آلات بالکل قریب تھے اور حیات انہیں خود ہی مرمت بھی کر سکتی تھی اگر چہ کہ وہ لامحدود تفصیلی پیچیدگی کے حامل تھے اور ساتھ ساتھ اپنے وظائف ادا کرنے میں شاندار آسانی بھی رکھتے تھے۔ حیوانی آلات کے مقابلے میں انسانی شعور کے بنائے آلات محنت طلب ہیں اور استعمال میں عموماً دقت طلب۔ تاہم یہ بلند سطحی شعور انسان کو مکمل آزادی دیتا ہے کہ وہ جیسے بھی آلات چاہے تعمیر کرے اور مادے کی جو بھی شکلیں چاہے پیدا کرے۔

مادہ حرکت کے بغیر ناقابلِ تصور ہے اور حرکت ایک اندرونی تحریک یا مقصد کے بغیر ناممکن ہے۔

اور حرکت تمام تر کشش اور استرداد کے باہمی کھیل پر مبنی ہے۔

کشش اور استرداد [attraction and rejection] حیات یا شعور کے اوصاف ہیں۔

بلند تر شعوری سطحوں پر کشش اور استرداد محبت اور نفرت کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔

منتخب کرنا اور مسترد کرنا حیات کا بنیادی وصف ہے جو اس کی صفتِ آزادی کی وجہ سے ہے۔

ایک ایٹم میں کشش اور استرداد کا وصف حیات کے شعوری عمل کو ظاہر کرتا ہے۔

حیات کے درجِ بالا اوصاف کے ساتھ ساتھ مادے کی تمام اشکال ریاضیاتی علامات کی نمائندگی کرتی ہیں جو ماقبل موجود شعور کے سبب ہیں۔ لہذا تمام تر مادہ حیات کا حامل ہے۔ یہ اپنے قوانین کے ساتھ زندہ ہے جو اس کے تخلیقی مرحلے سے جُڑے اور متعین ہیں۔

جو قوانین کاسموس میں پھیلے ہوئے ہیں وہ اس سے بلند تر نباتاتی مرحلے پر منطبق نہیں ہوتے۔

عین اسی طرح حیوانی حیات کے قوانین انسانی حیات پر لاگو نہیں ہوتے۔

ہر بلند تر خود مکتفی نظام میں تخلیقی طریقِ کار زیادہ پیچیدہ ہوتا جاتا ہے اور عظیم تر شعوری کیفیت میں نمودار ہوتا ہے۔ یہ طریق ہائے کار بالعکس یا اُلٹے رُخ پر نہیں چلائے جاسکتے۔

بلند تر قوانین اُن قوانین پر چھا جاتے اور حکومت کرتے ہیں جو سابقہ مراحل میں کام کر رہے ہوتے ہیں۔

کم تر مراحل کے قوانین اُن قوانین سے لاعلم رہتے ہیں جو بلند تر مراحل میں کام کرتے ہیں۔

اس سے یہ سامنے آتا ہے کہ کائنات میں جاری تمام حرکت پذیری یا عملی کاروائیوں کی پُشت پر شعور ہی ہوتا ہے جو رُوبہ عمل ہوتا ہے۔ اور یہ کہ مادے کی تمام صورتیں و اشکال شعور ہی کی اشکال کی نمائندگی کرتی ہیں جو علامتوں میں ظاہر کیا

گیا ہے۔

ہر بلند تر مرحلے میں مادے کی یہ علامتیں مختلف اور بلند تر مادی کیفیات کی علامتوں سے تبدیل ہو جاتی ہیں۔

اس سے ہمیں یہ اشارہ ملتا ہے کہ آخرِ کار مادے کے کوئی باقیات نہیں رہینگے بلکہ یہ سراسر تجریدی یا خیالی علامتوں میں تبدیل ہو جائیگا۔

انسانی ذات یا روح تو پہلے ہی مادی حالتوں سے ماوراء زندہ ہے اور اسی لیے ان تمام اشکالِ حیات پر حاوی ہے جو کائنات کے طول و عرض میں مختلف مادی علامتوں میں تخلیق کی گئی ہیں۔

حرکت[motion]

اب ہم مختصراً حرکت کی مجموعی خصوصیات زیرِ بحث لاتے ہیں۔ حرکت ہی حیات کی علامت اور اس کے وجود کا ثبوت ہے۔ حرکت اپنی غیر موجود یا ''لا'' [nihil] کی حالت سے یکدم نمودار ہوتی ہے اور بیرونی دنیا کی تخلیق کر دیتی ہے۔ حرکت کی وہ پہلی شکل جو روشنی کے پھوٹنے کی صورت نمودار ہوئی، اس نے ہماری کائنات کی بنیادیں استوار کیں۔ ہر اُس کاروائی کے ساتھ جو ہر ایک حرکت کے ہر قدم کے ساتھ تخلیق ہوتی رہی، خالق کی صفات رکھنے والے اُس کے مثالی پیکر نے اپنے پوشیدہ امکانات کو ظاہر کرنے یا اپنی غیر مادی کیفیتوں سے نمودار ہونے کے عمل کو بتدریج اور مستقلاً جاری رکھا۔ اس طرح نہ صرف یہ خارجی دنیا عدم وجود کی حالت سے وجود میں آئی، بلکہ مسلسل جاری تخلیقی عمل کے ساتھ زمان و مکان بھی پیدا ہوئے۔ لہذا زمان و مکان[time and space] شعورِ مطلق کی تخلیقی کاروائی کا نتیجہ ہیں۔حتیٰ کہ مادی مراحل میں بھی حیات کی تمام کاروائیاں اپنی پوشیدہ یا غیر مادی حالت سے نمودار ہوتی ہیں۔ یہ اس لیے کہ حیات یا شعور غیر مادی ہوتا ہے اور یہ ہمارے طبیعی حواس کے ادراک میں نہیں آسکتا۔ یہ صرف اپنے طرزِ عمل اور رویوں کے ذریعے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

وہ تمام تخلیقی کام جو ہم کائنات میں سرانجام ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں ان کا ماخذ شعورِ مطلق کی ذات میں ہے۔ اس کے نتیجے میں تخلیق جیسے بھی وہ ظہور میں آئی ہو، اپنے خالق کے لیے ایک فطری میلان یا کشش رکھتی ہے۔ کشش حیات کا ایک فطری وصف ہے اس لیے جہاں بھی کشش ہے وہاں حیات بھی موجود ہے۔ اس طرح حیات تخلیق کے ہر مرحلے میں موجود ہے اور یہ اپنے باطن میں بطور ایک مرکزہ[nucleus] مستحکم رہتی ہے۔ یہ ایک ایٹم میں بھی موجود ہے، ایک پودے میں بھی، ایک حیوان میں بھی مادی مراحل میں، اور ایک ذات یا روح کی شکل میں انسانی مرحلے میں بھی۔

کائنات میں حرکت یا عملی تحریک دو قسم کی ہوتی ہے۔ یا ہم کہ سکتے ہیں کہ یہ حرکت دو پہلو رکھتی ہے۔ ایک تو وہ ہے جس میں خالق اپنی تخلیق کے لیے کارفرما ہوتا ہے۔ اور دوسری وہ ہے جس میں تخلیق[حیات] اپنے خالق کی تلاش میں کارفرما ہوتی ہے، لیکن اُسی حد کے اندر جس قدر کہ اُس نے اپنے خالق کی آگہی حاصل کی ہے۔

درحقیقت تخلیق کا ہر عمل ایک محبت کا اور اظہارِ ذات کا عمل ہوتا ہے۔ذرا غور فرمایئے اور دیکھیے اقبال نے عشق کی اصطلاح سے اسی محبت اور کشش کے جذبے کو کس خوبصورت انداز میں بیان فرمایا ہے:

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم　　　عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دم بدم

عشق کی مستی سے پیکرِ گل تابناک | عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ | عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ | عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
عشق کے مضرات سے نغمۂ تارِ حیات | عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

کیونکہ تخلیق کے ہاں مرکز نگاہ، یا کشش کے ارتکاز کا نکتہ، اس کا خالق ہوتا ہے اس لیے تخلیق خالق کے لیے اپنے فطری تقاضۂ محبت کو اسے تلاش کرنے اور اس سے پیار کرنے میں آسودہ دیکھتی ہے اور محسوس کرتی ہے۔ جوں جوں تخلیق قدم بقدم پیش قدمی کرتی رہی، یہ اپنے خالق سے زیادہ سے زیادہ روشناس ہوتی رہی۔ تخلیق کے ابتدائی مراحل میں، یعنی کاسمک مرحلے میں، حیات اپنے خالق سے بہت کم آگاہ تھی، اسی لیے اس مرحلے میں زندگی غیر شعوری طور پر خالق کے ارادے کے مطابق کام کرتی رہی۔ اس سے خالق کے لیے اُس کی جبلی کشش ظاہر ہوتی رہی۔ بالفاظ دیگر، کائناتی مرحلے میں جوان گنت کہکشاؤں اور نظامہائے شمسی کی صورت میں نمودار ہوا، کائنات کی کاروائی خود بھی جزوی طور پر خود کو تنظیمی انداز میں منظم کرنے کی ذمہ دار تھی جیسا کہ خالق نے اس کے لیے ارادہ کیا تھا۔ یہ اُس مرحلے پر حیات کے سخت گیر رویے اور ردعمل سے ثابت ہے۔ سیارۂ زمین کے اگلے بلند تر مرحلے میں طبعی قوانین نے بھی رضامندی سے جزوی طور پر خود ایک نظام کی پیروی کرتے ہوئے اپنی تکمیل کو حاصل کیا، جیسا کہ خالق کی مرضی تھی۔ اس طرح بالکل ابتدائی مراحل میں تخلیق میں موجود خالق کی خواہش کے شعوری یا غیر شعوری اتباع کے فطری تقاضے نے دراصل جزوی طور پر اپنے اندر موجود خالق کی محبت اور کشش کے جذبے کو آسودگی عطا کی۔ آئندہ بلند تر مراحل میں یعنی نباتاتی اور حیوانی مراحل میں حیات اپنے خالق سے زیادہ آگاہ ہوگئی تھی اس لیے اسی کے مطابق خالق کی محبت کے جذبے کو آسودگی بخشنے کے لیے اس کی تخلیقی کاروائی زیادہ شعوری اور اپنی نوع میں رضاکارانہ تھی۔

آخر تخلیق کیوں؟

یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ پھر وہ ذاتِ مطلق آخر تخلیق کرتا ہی کیوں ہے۔

شعورِ مطلق کیونکہ خود میں یکتا ہے، اس لیے اس کی شخصیت لازماً غیر محدود صفات کی مالک ہے۔ جیسا کہ لفظ صفت [attribute] سے ظاہر ہے، یہ کچھ ایسی چیز ہے جو اپنے حامل یا مالک کے لیے ایک کشش اور لگاؤ [attraction] رکھتا ہے۔ ان صفات کے اظہار و نمود کے ساتھ شعورِ مطلق خود کو منکشف کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اظہارِ صفات شعورِ مطلق کا فطری تقاضہ یا خواہش ہے جس کے ذریعے وہ

اپنے وجود کو ظاہر کرتا ہے۔ اپنی صفات کے اظہار کے بغیر شعورِ مطلق اپنے مقصد کی بارآوری نہیں کر سکتا۔ شعور ایک یگانہ مرکزی وجود کی حیثیت میں رہتا ہے جسے ہم خودی یا شخصیت کہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ حیات جو اپنی صفات کے لیے ایک وجود یا ایک مرکزی کشش کے طور پر زندہ رہتی ہے، اسی طرح صفات امکانی حالت میں ذات کے اندر موجود رہتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر اگر خودی یا ذات روح ہے تو اس کی صفات موروثی طور پر اس کے اندر موجود ہوتی ہیں، جیسے کہ اس کا ''جسم''۔ خودی یا شخصیت خواہ وہ آسمانی ہو یا انسانی، اپنی صفات کے ساتھ ایک وحدت میں لازم وملزوم کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ صفات ذات کو اپنے اظہار کے لیے مائل کرتے ہیں،،،،، اور ذات ان کی چاہت سے قوت پا کر اپنی خوبصورتی اور اپنے امکانات کی نمائش کرنے کے لیے اپنا اظہار کرتی ہے۔

خود کو اس طرح اپنی صفات کے اندر منکشف کر کے خودی/ ذات اپنی قوت اور آسودگی حاصل کرتی ہے اور جب منکشف ہوتی ہے تو اپنے باطن سے ذات کے لیے محبت اور کشش کی عکاسی کرتی ہے۔ اس طرح تخلیق خالق کی ایک اندرونی خواہش ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ خود اپنے سحر اور اپنے حسن کا مشاہدہ کرتا ہے،،،،، مختلف النوع خوبیوں اور لامحدود امکانات کے تناظر میں۔

۔،۔،۔،۔،۔،۔

حیوانی وجود کی طبعی موت اور لافانی شعوری ذات

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہرِ ملکوتی خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

آیئے قارئین اب تحقیق کی اُن ٹھوس حدود میں داخل ہو جائیں جہاں یہ اہم سوال اپنے منطقی اور حتمی حل کو پہنچ جائے کہ انسانی طبعی یا حیوانی وجود کس طرح حقیقی انسانی وجود سے، جو کہ شعورِ ذات کے بلند درجہ کا حامل ہے، کس کس انداز میں یکسر مختلف ہے، اور کیوں کر حیاتِ آخرت کے بلند تر مرحلے میں منتقل ہو جانے کا مکلّف و مستحق ہے۔

تحقیق کچھ خشک ضرور محسوس ہوگی، قدرے طویل بھی ضرور ہے جیسے کہ ماقبل میں معذرت بھی کی گئی، لیکن توجہ سے کئی بار ملاحظہ فرمانے کا نتیجہ حرفِ راز سے کامل شناسائی کی صورت میں تسکینِ قلب و جاں کا سامان ہوگا۔ اور اذہان میں حیاتِ آخرت کے وجود کے بارے میں کسی پہلو سے بھی کوئی غیر یقینی کیفیت باقی نہ رہ جائیگی۔

انسانی حیات کو حیوانی حیات سے مطابقت دینے اور اسے بھی جبلتوں کے تابع ثابت کرنے والوں کے لیے اس جدید علمی بحث میں عظیم نشانیاں ہیں۔ نیز انسانی حیات کو فانی سمجھنے اور حیاتِ آخرت کا انکار کرنے والوں کے لیے یہ بحث ایک فاش گمراہی کے حتمی رَد کے لیے اتمامِ حجت کا درجہ فراہم کرنے کا باعث ہوگی۔ گمانِ غالب یہی ہے کہ اس کے آخر میں کہیں سے بھی فنا کی تائید میں کوئی بھی اور استدلال پیش نہیں کیا جا سکے گا۔ اور حیاتِ انسانی کی فنا کے مدعین اس حسرتِ ناتمام کو لیکر ایک خاسر و نامراد انجام کا انتظار فرمائیں گے۔ البتہ خالق کی محبتیں اور رحمتیں بے پایاں اور ابدی ہیں۔ اس کی راہنمائی اور رجوع کے در ہمیشہ کے لیے کھلے ہیں۔

تو آیئے معزز قارئین، ایک خالص علمی اور فنی [technical] تبادلۂ خیالات کی سمت قدم بڑھاتے ہیں۔

تخلیق کی انسانی سطح پر آدمی اپنے اُس خون اور گوشت سے بنے جسم میں نہیں رہتا جسے عمومی طور پر انسانی جسم کہا جاتا ہے۔ یہ جسم دراصل حیوانی مرحلۂ تخلیق سے نسبت رکھتا ہے کیونکہ اس کی شعوری اقدار بالکل وہی ہیں جو ایک حیوانی جسم کی ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر وہ جبلتیں جو انسانی جسم میں پائی جاتی ہیں بالکل وہی ہیں جو حیوانی طبعی نظام میں پائی جاتی ہیں۔ جذبہ جنس، خوراک کا حصول، مادرانہ محبت اور دیگر جبلتیں، جیسے کہ محاذ آرائی، فرار، پناہ، وغیرہ، دونوں جسمانی نظاموں میں مشترک ہیں۔ انسانی جسم کے خلیے مرتے اور ازسرِ نو تعمیر ہوتے رہتے ہیں۔ ایک دہائی میں یہ مکمل طور پر تبدیل ہو جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح انسانی جسم کے خلیے بھی مرتے رہتے، دوبارہ تعمیر ہوتے اور پرانے نئے سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اور جسم نوزائیدگی سے جوانی کی طرف اور جوانی سے

بڑھاپے کی طرف سفر کرتا رہتا ہے۔

جہاں تک شعوری اقدار کا تعلق ہے، وہی حسیات حیوانی جسم کا تعین کرتی ہیں جیسی کہ انسانی جسم میں پائی جاتی ہیں۔
علاوہ ازیں، بنیادی ضروریات جیسے کہ پناہ گاہ، خوراک، رہنے کے لیے سازگار ماحول اور تکلیف، بیماری سے بچاؤ، دونوں طبیعی اجسام میں مشترک ہیں۔

حیوانی طبیعی جسم ایک حسیاتی تنظیم کی شکل رکھتا ہے۔ جرثومے کی منتقلی کے ذریعے پیدائش کا عمل سرانجام دیتا ہے اور پھر، خلیات کے کمزور پڑ جانے یا ٹوٹ پھوٹ جانے کے ساتھ یہ جسم بھی غیر مستحکم ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی طبیعی حیات جو جسم کو کنٹرول کر رہی ہوتی ہے، اس کی موت کے ساتھ ہی معدوم ہو جاتی ہے۔

انسان کے طبیعی جسم کے ساتھ بھی اسی طرح کا معاملہ ہے۔ یہ بھی جرثومے کے ذریعے پیدائش کرتا ہے۔ ایک مکمل جسم کی شکل میں ترقی پاتا ہے اور پھر اس کی عضویاتی ٹوٹ پھوٹ کے ساتھ ہی اس کی طبیعی کارکردگی ختم ہو کر انجام پذیر ہوتی ہے۔ اس طرح وہ شعوری اقدار جو انسانی طبیعی جسم کا تعین کرتی ہیں وہی ہیں جو حیوانی طبیعی وجود کا تعین کرتی ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ انسان بلندتر شعوری سطح پر رہتا ہے، دونوں قسم کے طبیعی وجودوں میں جو مماثلت پائی جاتی ہے، ہمیں اس یقین کی طرف دھکیلتی ہے کہ آدمی بھی فقط ایک حیوان ہے جو اسی طرح جرثومے کی پیدائش ہے۔ مکمل طبیعی جسم میں ترقی پاتا ہے اور پھر اپنے طبیعی جسم کی شکست وریخت کے ساتھ زندگی سے محروم ہو جاتا ہے، جس طرح حیوانات کا معاملہ ہے۔ اس بنا پر کسی حیات بعد الموت کا تصور کرنا حماقت پر منطبق ہے۔

تاہم یہ درست نہیں ہے۔ یہ نظریہ گمراہ کُن ہے۔ اگر ہم حیات کے تخلیقی طریقِ کار کو مدّنظر رکھیں تو ہمیں یہ علم ہوگا کہ دراصل یہ طبیعی وجود یا جسم نہیں ہے جو حیات کو تشکیل دیتا ہے۔ بلکہ یہ تو حیات ہے جو اُس شعوری مرحلۂ تخلیق کے مطابق جس میں وہ اپنا وجود رکھتی ہے، اپنے گرد جسم کو نشوونما دیتی ہے۔

اگر یہ خود حیات نہ ہوتی جو اپنی شعوری سطح کے مطابق ایک جسم کی تشکیل کرتی، تو ہم کیسے یہ توقع کر سکتے تھے کہ صرف ایک جسم از خود حیات کی مختلف النوع اور ہمہ جہت اقدار کا علم رکھے اور ان کی تشریح بھی کر سکے۔۔۔ اس حیات کا جو ایک اکائی کی شکل میں زندہ ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تخلیقی طریقِ کار کے تحت حیوانی مرحلے کی تکمیل بہترین حیوانی شکل میں اس نکتہ پر ہوئی جسے ہم انسانی جسم کہتے ہیں۔ آدمی کا طبیعی جسم پوری حیوانی دنیا میں ایک تخلیقی شہ پارہ ہے کیونکہ حیوانی مرحلے نے اپنے بہترین تناسب میں اور بلندتر ترتیب میں اپنی اقدار انسان کے طبیعی جسم میں مکمل کی ہیں۔ یہی حقیقت کہ انسانی جسم تمام حیوانوں سے زیادہ خوبصورت ہے، ہمارے اس نظریے کو قوت دیتا ہے کہ وہ حسّی اقدار جو انسانی وجود میں حاصل کر لی گئیں، وہ حیوانی مرحلۂ حیات میں اپنے مکمل تناسب کے باوجود،

پہلے کبھی کسی اور حیوان میں حاصل نہیں کی گئیں۔

تخلیق کے بنیادی قانون کے مطابق ایک مخصوص مرحلے پر شعوری اقدار کی تکمیل پر، حیات نے، جس نے اُس مرحلے پر اپنی ابتدا کی تھی، اب لازمی طور پر ایک بلند تر تخلیقی درجے پر ایک نئے مرحلے کے روپ میں دوبارہ شروعات کرنی ہوتی ہیں۔ تخلیق کے اولین اصول کو مدّنظر رکھتے ہوئے یہ قطعی واضح ہے کہ انسانی مرحلے پر آدمی کی شعوری اقدار، بمقابلہ سابقہ مرحلے کی اقدار کے، لازماً نہ صرف معیار میں بلند تر ہونی چاہئیں بلکہ یہ اقدار اپنی نوع میں بھی مختلف ہونی چاہئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر بلند تر اقدار صرف معیار میں مختلف ہونگی تو پھر ایک نیا مرحلہِ تخلیق کھولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔ زندگی اُسی مرحلہ پر جاری رہیگی اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ انہی اقدار کے بلند تر معیارات حاصل کرلے گی۔

نئی بلند تر شعوری اقدار پر مبنی نئے مرحلے کی ابتدا کے نتیجے میں یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ بلند تر زندگی اپنے ساتھ ایک منفرد اور بلند تر عملی جسمانی ساخت بھی ساتھ لے کر آئے تاکہ وہ اپنی حاصل کردہ شعوری سطح کے مطابق اپنی اقدار کی نمود کرسکے۔ لہٰذا <u>اگرچہ کہ انسانی ذات حیوانی جسم کے ساتھ منسلک رہتی ہے، مگر یہ دراصل اپنی ذہنی کیفیت یا ذہنی جسم میں زندہ رہتی ہے جو کہ ایک ایسا جسم ہے جو بجائے سابق مراحلِ حیات کی طرح مادی نمونوں کی علامتوں پر بنائے جانے کے، خالص شعوری یا تجریدی علامتوں پر تراش کر بنایا گیا ہے۔</u>

اس باب میں اب ہم انسانی مرحلہِ حیات کی شعوری اقدار کو زیرِ بحث لائیں گے تاکہ ہم یہ جائزہ لے سکیں کہ انسان کی شعوری اقدار کس طرح اپنی نوع میں سابقہ حیوانی مرحلے کے مقابلے میں مختلف ہیں۔ اگر یہ ثابت ہوگیا کہ انسان بالکل مختلف قسم کی اقدار کے ساتھ زندہ ہے تو یہ حقیقت ہمیں دوررَس نتائج مہیا کرے گی۔ ہم خاص طور پر یہ ثابت کرسکیں گے کہ انسان اپنی طبعی یا حیوانی وجود میں نہیں رہتا اور اس لیے وہ قوانین جو حیوانی اجسام پر منطبق ہوتے ہیں وہ انسان کے شعوری وجود پر منطبق نہیں ہوتے۔ یہ تجزیہ اپنی نوعیت میں بہت ہی چونکا دینے والا ہوگا کیونکہ جیسا کہ ماقبل کی تحقیق میں کہا گیا، اگر یہ ثابت ہوگیا کہ آدمی حیات کے ایک بلند تر درجے پر فائز ہے تو اس کا مطلب ہوگا کہ وہ لازماً اپنی ذہنی کیفیات یا مجرد شعوری جسم میں زندہ ہے جو کہ شعور کی مادی حالتوں سے یکسر مختلف ہے۔ تو آیئے تجزیے کا آغاز کرتے ہیں:۔

[ا] جب ہم ان شعوری اقدار پر غور کرتے ہیں جو حیوانی مرحلہِ حیات اور انسانی مرحلہِ حیات میں ظاہر ہوتی ہیں تو ہمیں علم ہوتا ہے کہ حیوان مکمل طور پر حیات کی مادی حالتوں سے پیوستہ رہتا ہے، جیسے کہ ایک مچھلی سمندر میں۔ وہ نہ تو حقیقتِ مطلق سے آگاہ ہے اور نہ ہی اپنی ذات سے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں انسان ایک ایسی حالتِ شعور میں رہتا ہے جہاں مادی کیفیات کا بھاری پردہ چاک ہوچکا ہے اور جہاں اسے حقیقتِ مطلق کی ایک راست بصیرت دی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ خود کو جاننے پر بھی قادر ہے۔

یہ ایسے ہی ہے گویا کہ وہ تخلیق کی مادی سطح سے برآمد ہو کر شعوری دنیا میں جنم لے چکا ہے جہاں ذاتِ مطلق کا راست احساس رکھنے کیوجہ سے وہ خود آ گاہی حاصل کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ یہ اس طرح ہی ہے جیسے وہ مادی سطحِ تخلیق سے نکل کر اپنی شعوری حالتِ پیدائش میں آ گیا ہو جہاں ذاتِ مطلق کی آ گہی نے اسے خود آ گہی کے قابل بنا دیا ہے۔ یہ اس حقیقت سے عیاں ہے کہ جس طرح ایک حیوان اپنے اعضاء اور جسم کا علم رکھتا ہے، اور اپنے اردگرد کے ماحول کا بھی، اسی طرح انسان اپنی شعورِ ذات کے سبب نہ صرف اپنے اعضاء اور قریبی ماحول کو جانتا ہے بلکہ اسکا علم تمام کائنات کا احاطہ کرتا ہے۔ علاوہ ازیں، اپنی شعورِ ذات کی وجہ سے خود سے ایک مختلف شخصیت کے روپ میں آ گاہ ہے جو کہ تمام کائنات سے علیحدہ اور ممتاز وجود رکھتی ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ کوئی حیوان خود کو اس طریق پر جاننے کے قابل نہیں ہے۔ مزید برآں، شعورِ ذات کے ذریعے انسان اس قابل ہے کہ اپنی ذہنی کیفیات کو شعوری اشیاء کی طرح ہینڈل کر سکے۔ حیوان جو فقط ایک تنظیمی ڈھانچے کی سطح پر زندہ ہے، اپنی مادی حالتِ شعور میں ڈوبا رہتا ہے اور یہ اپنے تصورات میں اس حالت سے ایک لمحہ کے لیے بھی باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی شعوری اقدار نہ صرف حیوانوں سے بلند تر ہیں بلکہ ان سے یکسر مختلف بھی ہیں، بلکہ یہ پوری کائنات میں منفرد ہیں۔

۲] اپنی شعوری ذات کی خوبی کی وجہ سے انسان جو کچھ بھی تعمیر کرتا ہے وہ اپنی نوعیت میں بالکل منفرد طور پر انسانی سطح رکھتا ہے۔ مثلاً زبان وہ مفعول ہے جس کا فاعل شعورِ ذات ہے۔ شعورِ ذات اور زبان باہم ناگزیر ہیں کیونکہ یہ ایک کُل کے دو نصف ہیں۔ اور یہ انسانی مجلسی زندگی کے کردار، اداروں اور فنون کے لیے ناگزیر ہیں۔ اگر کوئی حیوان بھی شعورِ ذات رکھتا، تو وہ اس صلاحیت کی بنیاد پر زبان کا ایک ڈھانچہ ضرور تعمیر کر لیتا جیسا کہ انسان نے کیا ہے۔ لیکن کسی حیوان نے ایسا نہیں کیا۔ لہٰذا ہم نتیجہ نکالتے ہیں کہ کوئی حیوان خود سے آ گاہ نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انسانی شعوری اقدار منفرد ہیں اور ان تمام شعوری اقدار سے بالا ہیں جو کائنات کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی حیات میں نمایاں ہوتی ہیں۔

۳] حیوانی وجود، جبلتوں کے دباؤ کے تحت عمل پذیر ہوتا ہے۔ یہ امر حیوانی مرحلۂ تخلیق سے ماقبل کے طبیعی مراحل سے مماثلت رکھتا ہے جہاں حیات ایک نیم شعوری کیفیت میں ''سبب اور نتیجے'' [cause and effect] کے تسلسل میں کام کرتی ہے۔ بالفاظِ دیگر حیوانی وجود، جبلتوں کا اسیر رہتا ہے کیونکہ حیوان خودی یا شخصیت کا مالک نہیں ہوتا۔ ذات یا شخصیت سے محرومی کا مطلب یہ ہے کہ وجود ابھی تکمیل سے دور ہے اور نامکمل ہوتے ہوئے یہ اپنے ماخذ یا خالق کی ذات کو محسوس نہیں کر سکتا۔ اور یہ ہمیشہ صرف اپنے ماخذ کے حوالے سے ممکن ہوتا ہے کہ زندگی خود کو جان سکے۔ اس راست احساس کی عدم موجودگی میں حیات صرف اپنے مادی اور غیر نشو و نما یافتہ حالتوں میں رہتی ہے جہاں یہ مثالی علامتوں کے ذریعے غیر شعوری طور پر مصروفِ کار رہتی ہے۔ اس کے برخلاف جہاں بھی ضروری ہو، انسان جبلی دباؤ کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیتا ہے جو اس کے طبیعی یا حیوانی

وجود سے اُبھرتی ہیں۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ انسان اپنے مادی جسم سے بالکل آزاد ایک علیحدہ جسم میں رہتا ہے۔ یہ جسم جو انسانی ذات نے اس طرز پر تشکیل دیا ہے، لازماً مادی یا غیر ارتقاء یافتہ [crude] حالتِ حیات سے بلند ہے۔ مناسب الفاظ کی غیر موجودگی کے سبب ہم اسے انسانی ذات کا ''ذہنی جسم'' کہہ سکتے ہیں۔

[۴ حیات انسانی شعورِ ذات کے مرحلے سے قبل ایک ابتدائی غیر ترقی یافتہ حالت میں تھی اور ذہنی لحاظ سے خود سے آگاہ نہ تھی۔ ان مراحل میں طبعی وجود کی کارکردگی اسباب اور نتائج کے تسلسل سے انگیخت ہوتی تھی۔ سبب و نتیجہ کی کاروائی بہتر طور پر اس طرح سمجھی جاسکتی ہے جیسے کہ حیات خوابیدہ ہو اور کوئی سبب اسے عمل کے لیے اُکسائے یا تقاضہ پیدا کرے۔ تاہم انسانی مرحلے میں انسان کسی بھی سبب سے انگیخت ہونے سے انکار کرسکتا ہے اگر ایسا ارادہ کرلے۔ اگر کوئی سبب اسے عمل کے لیے متحرک کرے وہ اسے مسترد بھی کرسکتا ہے اور کسی اور وقت کے لیے موخر بھی۔ انسان کا یہ انتخاب کہ وہ ایک وجہ کو مسترد یا موخر کردے، اور دوسری پر عمل درآمد کرے یہ ظاہر کرتا ہے کہ اگر انسان کسی سبب کے تحت عمل درآمد کا انتخاب کرتا ہے تو وہ ایسا خود اپنی آزاد مرضی سے کرتا ہے۔ مثلاً اگر ایک حیوان بھوکا ہے تو وہ اپنی کھانے کی جبلت کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ لہذا جب تک کھانہ لے چین سے نہیں بیٹھے گا۔ لیکن انسان کے معاملے میں، اگر انسان چاہے تو وہ اس جبلی تقاضے کے خلاف بھی جاسکتا ہے اور اسے کسی دوسرے وقت کے لیے اُٹھا رکھ سکتا ہے۔ یہاں بھی کسی دوسرے وقت کا انتخاب انسان کی آزاد مرضی و ارادے کے ہاتھ میں ہے۔ پس، پہلے مرحلے میں انسان کھانے کے جبلی دباؤ کے آگے جھکنے سے انکار کر دیتا ہے۔ پھر اگر وہ جھکتا بھی ہے تو وہ یہ عمل اپنے آزاد ارادے سے کرتا ہے۔ یعنی اس حالت میں بھی انسان خود ہی وہ وقت منتخب کرتا ہے جو اسے موزوں لگتا ہے۔ یہ اس کائنات میں ایک منفرد واقع ہے کہ یہاں زندگی اپنے آزاد ارادے سے، بہت سے اسباب میں سے ایک کو منتخب کرتی ہے۔ ایک اور ناقابلِ فراموش نکتہ یہ ہے کہ انتخاب کے وقت کا تعین انسان نے زمانہ حال کو نظرانداز کرتے ہوئے، مستقبل کے لیے کیا ہے۔ مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے وقت کا انتخاب صرف وہی ذات تصور میں لاسکتی ہے جو خود آگاہ ہو۔ یہ بھی ہے کہ مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے کسی فائدے کو دیکھ پانا ایک سبب صرف اُس وقت بن سکتا ہے جب انسانی ذات مستقبل میں چھپے فوائد کا ادراک رکھتی ہو اور اس طرح یہاں تحرک کا سبب خود فاعل ہی پیدا کر رہا ہے۔ یہ جیسا کہ پہلے بھی زور دیا گیا، ایک منفرد وقوعہ ہے۔ ہم ساری کائنات میں کوئی ایک بھی سابقہ مثال ایسی نہیں پاتے کہ جہاں کسی فاعل نے خود ہی عمل کے لیے خودمختاری کے ساتھ ایک سبب پیدا کیا ہو۔ بالفاظِ دیگر، یہ صرف خود آگاہ انسان ہی ہے جو فاعل ہونے کی حیثیت سے خود اپنا سبب پیدا کرتا ہے اور پھر اس سبب کے نتائج بھی اپنی آزاد مرضی سے قبول کرتا ہے۔

[۵ یہ سچ ہے کہ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حیوان نے اپنی جبلت کی خلاف ورزی کی ہے۔ لیکن جانور یہ صرف ایک زیادہ طاقتور جبلت کے دباؤ کے تحت کر پاتا ہے۔ مثلاً اگر ایک جانور اپنی کھانے کی جبلت کی تسکین کر رہا ہے اور اچانک ایک

آدمی اس پر حملہ کر دیتا ہے، جانور بھاگ جائیگا۔ درحقیقت یہاں کھانے کی جبلت کی خلاف ورزی کا سبب ایک زیادہ طاقتور، جان بچانے کی جبلت ہے۔ مذکورہ صورتِ حال میں حیوان بمقابلہ ایک قدرے کمزور کھانے کی جبلت کے ایک قوی تر فرار کی جبلت کے زیرِ اثر آ گیا۔ اگر حیوان نے فوری فرار کا فیصلہ نہ کر لیا ہوتا تو اس کی جان ضائع ہو جاتی۔ لہذا یہاں جانور نے فوراً ایک قوی تر، جان بچانے والی جبلت کی تسکین کرتے ہوئے تحفظ کا راستہ اختیار کیا۔ ان دونوں حالتوں میں جانور مکمل طور پر آزاد نہیں تھا۔ وہ صرف جبلتوں کے دباؤ کے زیرِ اثر رہا۔

۶] حیوان کبھی اپنی جبلتوں کی ضرورت سے زیادہ تسکین کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ وہ جبلتوں کی تسکین بالکل ان کی طبعی ضروریات کے مطابق کرتا ہے۔ تاہم انسانی مرحلہ پر جبلتوں کی تسکین کی کشش معمول کی ضروریات سے تجاوز کر جاتی ہے جس میں انسان کے خود مختار آزاد ارادے کی جھلک نظر آتی ہے۔

۷] حیوانی وجود کے خلیات پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں اور اس طرح ایک حیوان کی طبعی عمر میں اس کا وجود کئی بار تبدیل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف انسان کے آئیڈیلز، فکر اور کارنامے، انسانی ذات کے ساتھ بغیر تبدیلی کے اور مکمل محفوظ حالت میں زندہ رہتے ہیں۔ ان طبعی تبدیلیوں کے برخلاف جن سے حیوانی وجود بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی اور بڑھاپے تک گذرتا ہے، انسانی تصورات، فکر اور اعمال کا برقرار رہنا ایک مکمل ثبوت ہے کہ انسانی ذات طبعی حالت میں، اس طبعی وجود کے اندر نہیں رہتی جس کے ساتھ وہ اپنے تخلیقی مرحلے میں منسلک ہے۔ اور جو موت کا شکار ہو جاتا ہے۔

۸] انسانی دماغ بچپن سے شروع ہو کر ایک مخصوص حد تک ترقی کرتا ہے۔ اُس حد کے بعد مزید ترقی دماغ نہیں بلکہ فرد کا علم کرتا ہے۔ اسی کے مانند حیوانی مرحلے میں نئے انواع کی ظہور کے ساتھ ان کا دماغ ایک مخصوص حد تک ترقی پذیر رہا، جو کہ انسانی زندگی کی شکل بھی ہے۔ انسان میں اس کے بعد یہ نوع یا دماغ نہیں جس کی ہم مزید ترقی کی توقع کریں، بلکہ یہ انسانی شعورِ ذات ہے جو ترقی کرتی رہتی ہے۔ یہ امر کہ انسان خود آگاہ ہے اس کا اشارہ ہے کہ شعور کا طبعی آلہ یا عضو، یعنی دماغ، اس کے اندر اپنی کاملیت کو پا چکا ہے۔ بنابریں، انسان کی مستقبل کی تخلیق اپنا اظہار اپنی خودی کے علم میں ترقی سے کرے گی، اپنے دماغ یا جسم کی مزید اعلیٰ ترقی سے نہیں۔ لہذا یہ واضح ہے کہ انسان ایک خود مختار اور منفرد مرحلے میں رہتا ہے جو حیوانی مرحلہِ حیات سے جدا ہے۔

۹] حیوان کا دماغ حیوانی وجود کی ایک اکائی یا مرکزے کی طرح ایک مادی حالت میں رہتا ہے۔ لیکن شعورِ ذات کے مرحلے میں انسانی ذات اس کے حیوانی دماغ میں نہیں رہتی۔ یہ اپنے ''ذہنی جسم'' میں رہتی ہے جو اپنی نوع میں غیر مادی ہے۔ <u>انسانی ذات کے ذہنی جسم کی نشو و نما کا ذریعہ علم ہے</u>، جبکہ اس کے حیوانی دماغ یا اس کے حیوانی وجود کی نشو و نما اس مادی خوراک سے ہوتی ہے جو مختلف کیمیاوی مادوں پر مبنی ہے۔ یہ امر ثابت کرتا ہے کہ دماغ اور ذہن کی شعوری اقدار بالکل مختلف ہیں۔ دماغ جو

طبیعی وجود سے متعلق ہے، مادی حالت میں رہتا ہے، جب کہ ذہن یا ذہنی وجود جو شعوری ذات سے متعلق ہے، غیر مادی ہے۔ بالفاظِ دیگر حیوانی حیات مادی حالت میں رہتی ہے اور انسانی ذات یا روح غیر مادی حالت میں۔

۱۰] انسان ننگا رہنے میں بے عزتی اور شرم محسوس کرتا ہے۔ انسانی مرحلے کے بالکل ابتدا میں وہ پہلی چیز جس نے اسے کسی غلط [گناہ] کا احساس دلایا وہ اس کی جانوروں کی مانند برہنہ حالت تھی۔ لہذا اس نے اپنے اعضائے تناسل پتوں اور چھال سے چھپا لیے۔ یہ ایک مکمل اشارہ تھا کہ انسان نے خود آگہی حاصل کر لی اور ایک روشن تر شعوری روشنی میں وہ براہِ راست اپنی اُن روحانی اقدار سے روشناس ہو گیا جو حیوانی حیات کی پست اور مادی اقدار سے الگ تھیں۔ اس نے خود کو اپنے اعضائے تناسل کی نمائش کرتے ہوئے پست اور غیر مہذب خیال کیا جو حیات کے حیوانی پہلو سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سے بھی یہ بات پایہِ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ انسان کم تر اور مادی حیوانی حالت سے علیحدہ ایک اعلٰی تر درجے پر رہتا ہے۔

۱۱] تمام طبیعی تکالیف اور خوشیاں حیوانی وجود سے تعلق رکھتی ہیں۔ طبیعی وجود کی تکالیف اور خوشیوں کے ساتھ کچھ مختلف اور منفرد تکالیف اور خوشیوں کے درجے بھی ہیں جن سے حیوانی وجود کبھی آگاہ نہیں ہوتا، اور جن سے انسان بالکل انفرادی طور پر گذرتا ہے۔ مثلاً انسان کی زندگی کے دُرست آئیڈیل کے انتخاب میں ناکامی یا سوشل زندگی میں جائز عزت حاصل کرنے میں ناکامی، ایسی تکالیف/ دکھ ہیں جن کا طبیعی جسم سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ذہنی دکھ زیادہ تر اور انفرادی طور پر صرف انسان میں ہی ظاہر ہوتے ہیں۔ حیوانی وجود کبھی ایسے روحانی جذبات سے آگاہ نہیں ہوتا۔ یہ ہمیں صاف بتاتا ہے کہ انسان کی شعوری اقدار اور رجحانات منفرد ہیں اور ان شعوری اقدار اور رجحانات سے بلند تر ہیں جو حیوانی وجود میں پائے جاتے ہیں۔

۱۲] حیوانی وجود سادہ طرز پر ایک نظم کے اندر رہتا ہے تاکہ زندگی کی سرگرمیاں ادا کرتا رہے اور اپنی ذات سے ایک منفرد وجود کی حیثیت سے متعارف نہیں ہوتا۔

۱۳] حیوانی وجود ایک مخصوص حد تک نشوونما پاتا ہے اور تکمیل تک پہنچنے پر اس کا فریضہ جبلی تقاضوں کی تسکین ہے۔ ان تمام جبلتوں کا مقصدِ حیات کو اس مرحلے پر محفوظ اور برقرار رکھنا ہے۔ ہر جبلت ایک علیحدہ وظیفہ ادا کرتی ہے اور اپنا ایک علیحدہ دباؤ رکھتی ہے جو جانور کو ایسے عمل کیطرف لے جاتا ہے جو وجود کے تسلسل سے تعلق رکھتا ہے۔ ہر جبلت اپنا دباؤ براہِ راست وجود پر ڈالتی ہے اور وجود بطورِ فاعل جبلت کے تقاضے پر جھک جاتا ہے یہاں تک کہ جبلت مطمئن ہو جائے۔ جبلتیں اور وجود ایک ایسی متوازن تنظیم میں رہتے ہیں کہ وجود اور جبلتیں باہم ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں۔ اگر وجود کسی بھی جبلی تقاضے کو آسودہ کرنے میں کامیاب ہو جائے تو انعام میں اسے وجود کے مادی لیول پر حسیاتی لُطف انعام کے طور پر حاصل ہوتا ہے۔ اس صورت میں کہ وجود کسی بھی جبلی تقاضے کو آسودہ کرنے میں ناکام ہو جائے تو جبلت اپنا دباؤ برقرار رکھتی ہے اور وجود ایک مسلسل

بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں طبعی وجود کا جنت اور جہنم اس خوشی اور تکلیف تک محدود ہے جو وجود کی مادی سطح تک پہنچتا ہے۔ وہ حِظ جو طبعی وجود کھانے یا جنسی عمل کرنے میں اُٹھاتا ہے، وہ وہیں تک قائم رہتا ہے جہاں تک وجود کی ان جبلتوں کو آسودہ کرنے کا عمل ہوتا ہے۔ اسی طرح دکھ اور خوشی کا قریبی تعلق جسم کی مادی حالت سے ہے۔ خوشی کی سطح اور نوعیت ہر جبلت کے ساتھ علیحدہ ہے جو زندگی کی حفاظت اور تسلسل میں اس کی افادیت کے مطابق ہے۔ مثلاً کھانے اور جنس کی جبلت براہِ راست زندگی کے تحفظ اور تسلسل سے جڑی ہیں اسی لیے بڑی خوشی اور کشش ان جبلتوں سے وابستہ ہے۔ وہ عظیم انعام جو وجود جبلی لذت سے حاصل کرتا ہے، ان جبلتوں کی تسکین کے لیے وجود کو زیادہ بڑی کوششیں کرنے پر اُکساتا ہے۔ اگر وجود کسی غیر معمولی سماجی حالت یا قحط کے باعث اپنی کسی بھی جبلت کو آسودہ کرنے میں ناکام ہو جائے تو وجود طبعی تکالیف اور دباؤ برداشت کرتا ہے۔ وجود اور بھی زیادہ سنجیدہ کیفیت کا سامنا کرتا ہے جب اسے زندگی کو لاحق خطرے کا سامنا کرنا پڑ جائے، جیسا کہ جسم کو اندرونی یا خارجی زخم۔ ایسی سنجیدہ صورتِ حال میں وارننگ کا سگنل زیادہ مادی ہوتا ہے اور اس کا مقصد وجود کو اس قابل کرنا ہوتا ہے کہ وہ تحفظِ خویش کے لیے فوری تدارک کے اسباب تلاش کرے۔

[۱۴] جبلی لذت یا طبعی تکالیف اور مصائب اپنی نوعیت میں مادی ہوتے ہیں۔ جب کہ اس کے برعکس، خوشی اور مسرت اور ذہنی تکلیف جیسے کہ پریشانی اور غم وغیرہ انسان کی شعوری ذات یا شخصیت سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ خوشی کا احساس ذہنی تکلیف ہی کی طرح اپنی نوعیت میں روحانی ہے کیونکہ ذات یا شخصیت اپنے ماخذ کی پہچان کے ساتھ اُبھرتی ہے۔ کیونکہ انسانی ذات زیرِ تکمیل ہے اس لیے یہ اپنے ماخذ کو آئیڈیلز کی شکل میں تلاش کرتی ہے۔ اگر ذات اپنے مثالی پیکر کی تلاش میں کامیاب ہو جائے تو یہ خوشی محسوس کرتی ہے۔ اگر وہ ناکام رہ جائے تو یہ غم اور افسوس کا شکار ہوتی ہے۔ یہ یاد رہے کہ ہر انسانی فعل شعوری ذات سے جڑا ہوتا ہے اور ذات تبھی خود آگاہ ہو سکتی ہے اگر وہ اپنے آئیڈیل یا مقصد سے آگاہ ہو۔ یہ آئیڈیل پست ہو یا بلند، صحیح ہو یا غلط، بہر حال ذات کے لیے ایک آئیڈیل ضروری ہے جو اس کی شعوری سطح کے مطابق ہو۔ اگر ایک شعوری ذات ایک آئیڈیل یا مقصد نہیں رکھتی تو وہ شعورِ ذات کے مرحلے پر نہیں رہ سکتی نہ ہی وہ کسی شخصیت کی مالک ہو سکتی ہے۔ اس طرح انسان کا ہر ایک فعل اس کے آئیڈیل کی تقلید و پیروی میں عمل پذیر ہوتا ہے اور ذات اپنی سرگرمیوں سے مکمل باخبر رہتی ہے۔

[۱۵] اب اگر ہم انسانی ذات کی خوشی اور مسرت کا جبلی لذتوں سے موازنہ کریں اور اسی کے مانند انسانی رنج و غم کا موازنہ جسمانی تکالیف اور دکھ سے کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ جبلی لذتیں بمقابلہ انسانی ذات کی خوشیوں اور مسرتوں کے، بہت کم تر ہیں۔ اول الذکر حیات کے طبعی اور مادی پہلو سے متعلق ہیں، اور موخر الذکر حیات کی روحانی حالت سے متعلق ہیں۔ اسی کی مانند جسمانی تکالیف اور زخم ذہنی اور روحانی کرب کے مقابلے میں کم تر ہیں۔ بالفاظِ دیگر، حیوانی وجود کے دکھ اور خوشی کی سطح اور شعورِ ذات کے دکھ اور خوشی کی سطح اپنی شدت میں ہی مختلف نہیں بلکہ اپنی نوعیت میں بھی مختلف ہوتی ہیں اور مختلف قسم کی شعوری

اقدار کے مطابق ہوتی ہیں۔ جب کہ ایک کی سطح پست، محدود اور مختصر دورانیے کے لیے ہوتی ہے، جبکہ دوسرے کی سطح بلند، غیر محدود اور طویل ہوتی ہے۔

[۱۶ حیوانی وجود کی شعوری اقدار پانچ حسیات تک محدود ہوتی ہیں۔ یعنی ذائقے، لمس، سماعت، سونگھنے اور دیکھنے کی حس۔ جب کہ اس کے مقابلے میں انسانی ذات کی شعوری اقدار کی سطح اپنی نوعیت میں غیر مادی ہے اور اس کا سکوپ غیر محدود ہے۔ احساس، عقل، سوچ، وجدان اور تخلیقی صلاحیت وغیرہ، وغیرہ، ایسی شعوری اقدار ہیں جن کے ذریعے شعوری وجود اپنا آئیڈیل حقیقت کی شکل میں دیکھتا ہے۔ طبیعی وجود کی حسیاتی اقدار حیات کی مادی حالت تک محدود رہتی ہیں، لیکن انسانی ذات کی شعوری اقدار، غیر مادی ہوتے ہوئے ایک کائناتی سطح پر کام کرتی ہیں۔ جبکہ حسیات زندگی کی صرف مادی اور کمتر اقدار کا جائزہ لیتی ہیں، انسانی ذات اپنی بلند تر شعوری اقدار کے ساتھ نہ صرف کائنات کے رازوں سے پردہ کھولتی ہے، بلکہ ان کے ذریعے خود کو طبیعی وجود سے ماوراء ایک علیحدہ ذات میں لے جاتی ہے اور اُس تقاضے کے تحت جو اپنے آئیڈیل کو زیادہ سے زیادہ دریافت کرنا چاہتا ہے، کائنات کی حقیقت دریافت کرتی ہے۔

قارئین، ان سولہ نکات کو زیرِ بحث لانے کے بعد ہم اب اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ حیوانی وجود کی حسیاتی اقدار، یعنی پانچ مخصوص حسیات، زندگی کے مادی حالات کو کھوجتی ہیں، جب کہ انسانی ذات کی شعوری اقدار تخلیق کی مادی حالتوں سے ماوراء حقیقت کی تلاش کرتی ہیں۔ اس لیے چکھنے، لمس، سماعت، بصارت اور سونگھنے کی حسیں شعور کے ترازو میں کم تر ہیں اور یہ کبھی براہِ راست شعوری ذات کے تقاضے کو پورا نہیں کرسکتیں۔ اس لیے انسان کا حیوانی وجود یا طبیعی وجود کبھی زندگی کی مادی حالتوں سے اوپر نہیں اُٹھ سکتا۔ انسانی ذات کی شعوری اقدار کیونکہ غیر مادی ہیں، اس لیے وہ ہمیشہ کائنات کی حدود سے ماوراء بھی حقیقت کی تلاش میں مستقل منہمک رہتی ہیں۔

مختصراً، جب شعوری ذات اپنے باطن سے کائنات کا قریب سے مشاہدہ کرتی ہے تو درحقیقت اس کا مقصد زندگی کے اس مادی سفر میں اپنا مقام متعین کرنا ہوتا ہے۔ اور اس کے لیے وہ اپنے حیوانی وجود کی حسیاتی اقدار کا استعمال کرتی ہے۔ تاہم جب وہ کائنات سے ماوراء حقیقت کو دیکھنا چاہتی ہے، تو تب وہ انسانی ذات کی بلند تر سطح رکھنے والی شعوری اقدار کا استعمال کرتی ہے، جیسے کہ احساس، عقل، وجدان، سوچ و فکر، تخلیقی ذہنی صلاحیت وغیرہ۔

درجِ بالا سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ انسان ایک بالکل علیحدہ کائناتی شعوری مرحلے میں رہتا ہے جو کہ حیوانی وجود کی شعوری سطح سے بہت بلند ہے۔ یہ شعوری اقدار صرف درجے میں مختلف نہیں بلکہ اپنی نوعیت میں بھی مختلف ہیں۔ حیوانی مرحلے کی تکمیل کے بعد جب حیات انسان کی شعورِ ذات کے مرحلے میں داخل ہوئی تو یہ اس کے حیوانی وجود میں نمودار نہیں ہوئی۔ اس کی بجائے یہ ایک علیحدہ جسم میں ایک بلند تر سطحِ حیات میں شروع ہوئی۔ اگر اس نے اپنا سفر ایک علیحدہ جسم میں یا وجود میں شروع نہ کیا ہوتا تو یہ حیوانی حیات

کے سابقہ تخلیقی مرحلے سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ ارتقائی تھیوری کے ماننے والے یقین رکھتے ہیں کہ انسانی شعور فقط حیوانی شعور کی ایک ترقی یافتہ یا اضافی کڑی ہے۔ اسی سوچ کی وجہ سے وہ انسان کو ایک ''مجلسی حیوان'' کہتے ہیں۔ اس تحقیق کے مطابق یہ تھیوری گمراہ کُن ثابت ہوتی ہے۔ یہ ویسے بھی تخلیق کے بنیادی اصول کیخلاف جاتی ہے جس کے مطابق کوئی تخلیقی مرحلہ اپنے اختتام تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اُس نے اپنے مرحلے کی وہ مکمل اقدار انتہاء تک حاصل نہ کر لی ہوں۔ اور جب ایک مرتبہ مرحلے کی تمام اقدار حاصل کر لی گئی ہوں تو مرحلہ اپنی تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔ لہٰذا حیات کو اس کے بعد ایک نئے پلان پر نئی شعوری اقدار کے ساتھ شروع ہونا ہوتا ہے جیسا کہ خالق نے اس کے لیے منصوبہ بندی یا تعین کیا ہو۔ تخلیق کے اس اہم ترین اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں یہ یقین ہونا چاہیئے کہ انسانی خود شناسی کا تخلیقی مرحلہ تبھی نمودار ہوا جب حیوانی تخلیقی مرحلے نے اپنی مکمل اقدار انتہاء تک حاصل کر لی تھیں اور کسی بھی مزید تغیر کا راستہ خود پر بند کر لیا تھا۔ لہٰذا ہم انسانی شعورِ ذات کے مرحلے کو حیوانی مرحلے کی ایک اضافی کڑی نہیں سمجھ سکتے۔

جب بھی ایک بلند تر زندگی ایک نئے مرحلے میں ابتدا کرتی ہے، یہ اپنے ساتھ ایک فعال نظام یا جسم لے کر آتی ہے جو اُن اقدار سے مطابقت رکھتا ہے جن کا حصول لازمی اور متعین ہوتا ہے۔ درحقیقت حیات بلند تر مرحلہ پر نمودار ہی نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس نے نئے مرحلے سے وابستہ بلند تر اقدار کی نمود اور تحفظ کے لیے ایک علیحدہ جسم تشکیل نہ دے لیا ہو۔ ایک نیا فعال وجود ساتھ لانے کی ضرورت اس سادہ سی وجہ سے ہے کہ بلند تر شعوری مرحلے پر حیات کا تقاضہ ہمیشہ اپنی نوعیت میں مختلف ہوتا ہے اور اسی لیے یہ اُس حیات کے پہلو بہ پہلو نہیں رہ سکتا جو کمتر اقدار اور مختلف رجحانات رکھتی ہو۔ اگر بلند تر اقدار سابقہ اقدار کے ساتھ رہیں تو حیات کے نئے اور بلند تر رجحانات کی نمود ممکن نہیں ہوگی۔ لہٰذا اگر یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے کہ انسانی ذات کی شعوری اقدار بلند تر اور بمقابلہ حیوانی اقدار مختلف النوع ہیں تو انہیں لازماً ایک نئے جسم یا طبیعی وجود میں نمودار ہونا تھا جو کہ حیوانی وجود سے مختلف ہوں۔ بلند تر قسم کی شعوری اقدار اور انسانی ذات کے رجحانات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان حیوانی وجود کے اندر نہیں رہتا۔ تخلیقی طریقِ کار کا بنیادی اصول اس نظریے کی مکمل تائید کرتا ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان نے اپنی ابتدا اپنے خود آگاہ مرحلے میں ایک علیحدہ جسم میں کی اور کیونکہ حیات اپنا فعال وجود اپنی شعوری اقدار کے مطابق تشکیل دیتی ہے، اسی لیے شعوری ذات نے جو حیات کی مادی سطح سے ماوراء رہتی ہے، جو فعال نظام تشکیل دیا وہ بھی لازمی غیر مادی وجود پر مبنی ہونا چاہیئے۔ لہٰذا انسانی ذات اپنے ذہنی وجود میں رہتی ہے۔ یا زیادہ وضاحت سے کہیں تو شعوری ذات اپنی ذہنی حالت میں، مادی حالتِ حیات سے بلند رہتی ہے۔

یہ حقیقت ہمارے لیے انسان کے طبیعی جسم کی موت کے بعد اس کی زندگی کے آئندہ مکمل غیر مادی مرحلے میں تسلسل کے سوال کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیتی ہے، اُس سوال کو جس کا جواب دینا اب تک مشکل ترین امر رہا ہے۔

،-،-،-،-،

اختتامیہ

آیتِ مبارکہ ۸۴/۱۹: لترکبُن طبقاً عن طبقاً ۔ ترجمہ: تم لازماً طبق در طبق، یعنی مرحلہ در مرحلہ تشکیل پاؤ گے۔

یہ ہے مقصد گردشِ روزگار کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

اس سیر حاصل تحقیق کے بعد آیئے اب موضوع کو اس کے منطقی انجام تک پہنچاتے ہوئے ایک طائرانہ نظر سے تمام تر جائزہ لے لیتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ہم کائنات کے مختلف مراحل کی تخلیقی کاروائی پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ ہمیں یہ علم ہوتا ہے کہ تخلیق کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ حیات ایک بلند تر مرحلے میں داخل ہونے پر نہ ہی اُس خاص سطح سے کبھی نیچے آتی ہے، نہ ہی اُن اقدار میں سے کسی کو ضائع ہونے دیتی ہے جو اس مرحلے پر اس نے حاصل کی ہوں۔ مثلاً تخلیق کے طبیعی مرحلے پر اُس مرحلے کی وہ تمام شعوری اقدار جو زمین پر موجود طبیعی قوانین کی شکل میں نمودار ہوئی تھیں، اپنے مرحلے کی تکمیل پر مکمل طور پر محفوظ ہو کر برقرار رہ گئیں۔ درحقیقت یہ قوانین زندہ سیارہِ زمین نے باریک ترین تفصیل کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ محفوظ کر لیے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم زمین کے عمل فعل یا طریقِ کار کی ادائیگی میں کوئی بھی سقم نہیں پاتے۔ اس کے بعد، نباتاتی حیات کی تخلیقی مرحلے پر ہر نسل کی شعوری اقدار ایک نوع کی شکل میں اس مرحلے کی مجموعی مقصد کے تحت، ایک بیج کی شکل میں مکمل طور پر محفوظ کر لی گئی تھیں۔ اس مرحلے پر حیات نے اپنی جسمانی ساخت اور شعوری اقدار یعنی رجحانات اور طریقِ کار، بیج کے اندر ایک سبب اور نتیجے کے تسلسل کی صورت میں محفوظ کر لی تھیں۔ ان اقدار کے برقرار رکھنے کا مقصد حیات کے تسلسل کو اس کے تمام بھرپور اور وسیع تنوع کے ساتھ یقینی بنانا تھا تاکہ وہ بلند تر تخلیقی مرحلے کے لیے ایک بنیاد کے طور پر کام کرے۔

اگلے تخلیقی مرحلے میں حیوانی حیات نے بھی اپنی اقدار کو ایک علیحدہ نوع کی طرح جرثومہ کی شکل میں برقرار رکھا۔ اس مرحلے میں حیوان نے جبلت کے دباؤ کے تحت کام کیا جو کہ سبب اور اس کے نتیجے کے اصول سے مماثلت رکھتا تھا۔ جانور کا یہ فیصلہ کہ وہ ایک مخصوص جبلت کے دباؤ پر حاوی آ کر دوسرے زیادہ طاقتور جبلی دباؤ کی تعمیل کرے، اس بات کی نشانی تھی کہ حیوانی مرحلے میں حیات، طبعی اور نباتاتی مراحل کے مقابلے میں زیادہ آزاد تھی۔ لیکن کیونکہ حیوانی مرحلے پر حیات مادی سطح پر ہی رہتی ہے اس لیے وہ خود سے آگاہ نہیں ہے۔ اگلے انسانی بلند تر مرحلے پر انسانی ذات ایک مختلف تخلیقی مرحلے میں رہتی ہے۔ اس لیے یہ اپنی شعوری اقدار اپنی ذات یا روح کے 'بیج' یا 'جرثومے' میں محفوظ کر لیتی ہے۔ سب سے زیادہ اہم نکتہ یہ نوٹ کرنے والا ہے کہ انسانی شعورِ ذات سے قبل کے تمام تخلیقی مراحل میں ہر وجود نے شعوری اقدار ان کی نوعیت میں محفوظ اور منتقل کیں، ذات یا شخصیت میں نہیں۔ یہ اس لیے کہ اُن مراحل میں

حیات خود سے یا اپنی شخصیت سے آگاہ نہ تھی اور مادی علامتوں یا اشکال میں زندہ تھی۔ اسی لیے یہ اپنی اقدار صرف اپنی نوع میں ہی ایک وجود سے دوسرے وجود میں منتقلی کے ذریعے محفوظ کر سکتی تھیں۔

حیوانی مرحلے تک حیات ایک سبب اور نتیجے کے تواتر کے ذریعے عمل پذیر تھی اور اس کا مکمل نظام خود حیات نے مادی علامتوں کی شکل میں بیج یا جرثومے کی صورت اپنے تسلسل کے لیے محفوظ کیا تھا۔ مثلاً نباتاتی مرحلے پر ایک آم کے درخت کی منفرد شناخت اس کی نوع اور نسل میں ہوتی ہے، اس کی ذات میں نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ خواہ ایک آم کا درخت ہو یا ایک گندم کا پودا، پودوں میں حیات کبھی خودشناس نہیں ہوتی، اور اس سبب سے یہ کم و بیش ایک میکینیکل سطح پر ہی، سبب اور نتیجے کے اصول پر کام کر سکتی ہے۔ [یہاں یہ واضح کر دیا جائے کہ اس کائنات میں کچھ بھی میکینیکل یا خودکار نہیں ہے۔ حتّٰی کہ ایٹم بھی حیات رکھتا ہے اسی لیے یہ اُس تعلق سے عمل کرنے میں آزاد ہے۔ آزادی اور علم شعور کے اوصاف ہیں۔ جتنا زیادہ حیات اپنے مقصد سے آگاہ ہوگی، اتنا ہی زیادہ وہ خود سے عمل کرنے مین آزاد ہوگی۔] اس لیے نباتاتی مرحلے میں ہر نسل سختی سے اپنی شعوری اقدار کے حصول کے لیے زندہ رہتی ہے اور انہیں مکمل طور پر چھوٹی سے چھوٹی تفصیل میں برقرار رکھتی ہے۔ یہ اسی خصوصیت کی وجہ سے ہے کہ ہر نسل ایک ٹریڈ مارک کی مانند اپنی صورت اور اقدار کی حفاظت کرتی ہے۔ اسی کی مانند معاملہ حیوانات کے تخلیقی مرحلہ کا بھی ہے۔ حیوانی مرحلہ بھی ایک مادی مرحلۂ حیات ہے اور یہ اپنی نسلوں کی شعوری اقدار، نوعیت کے حساب سے اپنے مرحلے کے مجموعی پلان کے تحت قائم رکھتا ہے۔ خواہ یہ ایک گھوڑا ہو یا ایک مینا، ہر ایک اپنی اقدار ایک نوع یا نسل کے پیمانے میں برقرار رکھتا ہے۔ طبعی جسم کو شعوری اقدار تشکیل دیتی ہیں، اور شعوری اقدار اسی وجود کی شکل میں زندہ رہتی ہیں۔ دونوں حالتوں میں حیات زندہ رہتی اور طبعی وجود کو غیر شعوری طور پر متنوع علامات کے ذریعے کنٹرول کرتی ہے۔ اور یہ سب سبب اور نتیجے کے تسلسل کی پیروی کرتے ہیں۔ بمقابلہ نوعی اقدار کے جو نوع کی شکل میں ان مراحل میں محفوظ کی جاتی ہیں، وہ اقدار جو انسانی مرحلے میں محفوظ رکھی جاتی ہیں وہ شخصی یا ''ذاتی'' ہیں جیسا کہ لفظ ''شعوری ذات'' کے ذریعے زور دیا گیا ہے۔ اگر ہم شعوری ذات کو خارج کر دیں، تو انسانی مرحلے میں ذات یا شخصیت سے متعلق کوئی بھی شعوری اقدار موجود ہی نہ رہیں گی یا خود کو بچا نہیں پائیں گی۔ اس طرح انسانی مرحلے میں شعوری اقدار ہر فرد کے ساتھ یا شعوری ذات کے ساتھ ''ذاتی'' ہی رہنی چاہییں۔

ماحصل

ہماری اس بحث سے یہ بات صاف ہوگئی کہ

[اولاً] انسانی ذات اپنی ذہنی جسم یا ذہنی حالت میں خودمختار زندگی گزارتی ہے؛ اور

[ثانیاً] انسانی ذات مر نہیں سکتی نہ ہی یہ ایک ذات سے دوسری ذات میں اُس طرح منتقل ہو سکتی ہے جیسے پودوں اور حیوانات کی طبعی حیات، کیونکہ انسانی ذات ایک یگانہ و منفرد خود آگاہ ہستی کی طرح زندہ رہتی ہے۔

انسانی مرحلے میں صرف طبعی جسم کی شعوری اقدار ہیں جو قابلِ انتقال ہیں اور جو موت اور ٹوٹ پھوٹ سے عبارت ہیں۔لیکن انسانی ذات جو ایک بالکل علیحدہ غیر مادی حالت میں رہتی ہے،قطعاً مر نہیں سکتی کیونکہ یہ تخلیقی طریقِ کار کے بنیادی قانون کے خلاف ہے جس کے مطابق حیات اپنی حاصل کردہ سطح سے نیچے نہیں آسکتی اور نہ ہی یہ اپنی شعوری اقدار کو ضائع کر سکتی ہے۔

زندگی یا حیات لازماً اپنی نہایت مشکل سے حاصل کردہ اقدار کا تحفظ کرتی ہے،اپنی تمام باریک ترین تفاصیل کے ساتھ، کیونکہ بصورتِ دیگر تخلیقی طریقِ کار مزید آگے نہیں بڑھ سکتا۔

خود شناسی کے مرحلے سے قبل کے تمام تخلیقی مراحل دراصل شعوری ذات یا انسان کے ہی تخلیقی مراحل تھے۔ کیونکہ وہ شعوری اقدار جو شعورِ ذات کے تخلیقی مرحلے سے قبل پیدا کی گئیں،ابتدائی مراحل تھے اور خود آگاہ انسان کے نمودار ہونے کی راہ ہموار کرنا ان کا مقصد تھا،اس لیے وہ سب ایک غیر شعوری یا مادی حالتِ حیات میں رہتے تھے۔ اس حالت میں حیات جو خود سے آگاہی نہیں رکھتی تھی، پیدائش کے طریقِ کار پر ترقی پاتی اور منتقل ہوتی رہی۔ انسانی مرحلے پر پہنچ کر حیات اپنے خالق کے وجود سے براہِ راست آگاہ ہوگئی اور اپنے ماخذ کی پہچان کے ذریعے یہ اپنے آپ میں آداخل ہوئی۔ پھر انسان کے تمام اعمال وافعال اس کی شعوری ذات کے ذریعے سرانجام پانے لگے اُس مقصود کے ساتھ کہ اُس حقیقتِ مطلق کو زیادہ سے زیادہ دریافت کیا جائے جس نے انسان کو خود سے آگاہی دی تھی۔

ایک اور نظریے کے مطابق بھی آدمی مرتا نہیں ہے۔ حقیقت کے اس کے باطن سے جھلکنے کے ساتھ انسانی ذات خود کو پہچاننا شروع کر دیتی ہے۔ یہ ہمیشہ کسی دوسری حقیقت کے حوالے سے ہوتا ہے کہ انسانی ذات خود کو جان سکے۔ اس طرح،ایک مرتبہ اپنی ذات کی پہچان ہو جائے تو پھر انسانی روح یا شعوری ذات کوئی تبدیلی قبول نہیں کر سکتی۔ حتیٰ کہ موت یا تباہی بھی روح پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ ذات کی موت کا مطلب ہوگا حقیقتِ مطلق کی موت یا اُس ماخذ کی موت جس کی وجہ سے ذات پیدا ہوئی اور خود کو جاننے لگی۔

یہ امر ہمیں مزید اس نتیجے کی طرف لے جاتا ہے کہ انسان کی شعوری ذات ایک ایسی حقیقت ہے جو ایک مرتبہ اپنے ماخذ کو جان لینے کے بعد یعنی ''دوسری حقیقت'' کو جاننے کے بعد،کبھی بھی تباہ نہیں ہو سکتی۔

شعورِ ذات کے مرحلے پر ذات اپنی تمام سوچوں اور اعمال کو باریک ترین تفصیل کے ساتھ اپنے ذہنی آلات میں محفوظ کر لیتی ہے۔ اسی بناء پر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بے شک حیوانی وجود مستقلاً تبدیلی سے گذرتا رہتا ہے،لیکن انسانی ذات یا شخصیت اپنی جگہ مضبوطی سے قائم رہتی ہے۔ انسانی ذات اگرچہ اپنی پیدائش سے بوڑھاپے تک، حیوانی وجود کے ساتھ منسلک ہے،تاہم یہ اپنے تصورات،سوچ وفکر اور اعمال وافعال کو بطور ایک منفرد شخصیت خودمختار طریق پر محفوظ رکھتی ہے۔ اگر شعوری ذات بھی کسی تبدیلی کا ہدف ہوتی تو اس کی سوچ وفکر اور افعال کبھی ریکارڈ ہو کر محفوظ نہ رہتے۔

اس حقیقت کو کہ انسان کی شعوری ذات نہایت احتیاط سے اپنی سوچ وفکر اور افعال کو محفوظ کر لیتی ہے، نامور نفسیات دان، فرائڈ کی تائید وحمایت حاصل ہے جس نے انسانی ذہن پر ایک تسلسل کے ساتھ تجربات کے نتیجے میں یہ دریافت کیا۔ یہاں اس

نکتہ کی وضاحت کردینا چاہیے کہ فرائڈ کی اصطلاح ''id'' یا ''لاشعور'' جو اس نے انسانی ذہن یا ذات کے متعلق استعمال کی، وہی ہے جسے ہم ''شعوری ذات'' کہہ چکے ہیں اور جو ہماری تحقیق کے مطابق انسان کی تمام شعوری کاروائیوں کو محفوظ رکھتی ہے۔

فرائڈ لکھتا ہے: '' id میں ایسا کچھ نہیں ہے جس کا موازنہ عدم [لا ۔ negation] سے کیا جائے اور ہم اس میں فلاسفروں کے اُس اصرار سے، کہ زمان و مکان ہمارے افعال کا ایک ضروری حصہ ہیں، استثناء کی کیفیت دیکھ کر حیران ہیں۔ کیونکہ id میں ایسا کچھ نہیں ہے جو وقت کے تصور سے تعلق رکھتا ہو۔ اس میں امتدادِ زمانہ کی کوئی پہچان یا شناخت نہیں ہے [اور یہ ایک ایسی چیز ہے جو بہت ہی قابلِ ذکر ہے اور فلسفیانہ فکر میں خاطر خواہ توجہ کی منتظر ہے] اور وقت کے گذرنے پر ذہنی طریق کار میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ ذہن کے وہ تخلیقی رجحانات جو کبھی id کی طرف جبراً دھکیلے بھی نہیں گئے، اپنی اصل میں لافانی ہیں اور دہائیوں تک وہاں اس طرح برقرار رہتے ہیں جیسے وہ ابھی حال ہی میں واقع ہوئے تھے۔''

فرائڈ کے اس تحیر کا جواب، کہ ہر ایک واقع id میں محفوظ ہو جاتا ہے اور اس کاروائی میں وقت کے تصور سے کوئی تعلق بھی نہیں ہوتا، بہت ہی سادہ ہے۔ id ، یا لاشعور، کا واقعات کو محفوظ کر لینے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ جب حیات خود کو حیوانی وجود کی موت پر اس سے علیحدہ کر لے تو اس کے بعد بھی اس کا تسلسل یقینی رہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ زمان و مکان کے قوانین صرف اسی کائنات پر منطبق ہوتے ہیں۔ اگر اس کائنات کے علاوہ جسے ہم جانتے ہیں، کوئی اور بھی کائنات موجود ہو، جیسا کہ سائنس فی زمانہ ہمیں multiverse کی تھیوری کے ذریعے اشارہ دے رہی ہے، تو وہ یقیناً اس کائنات کے زمان و مکان کے نظام سے باہر اپنا وجود رکھتی ہوگی۔ ہماری موجودہ زندگی میں ہمارا ہر عمل زمان و مکان کے نظام کے اندر ہی بار آور/ بارز ہوتا ہے جو ایک ایسا نظام ہے جو اضافی ہے۔ لیکن اگر فرائڈ کے مطابق، ہم ضرور ایک ایسی ذہنی حیات رکھتے ہیں جو زمان و مکان کے اثر سے آزاد ہے، تو یہ ہمارے اس نظریے کی تائید کرتا ہے کہ انسانی ذات طبیعی وجود کی موت کے بعد بھی زندہ رہنا جاری رکھے گی۔ طبیعی وجود کی موت تو بذاتِ خود زمان و مکان کے اثر کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ انسانی ذہن یا ذات زمان و مکان کی اقلیم سے بلند رہتی ہے، جیسا کہ فرائڈ نے بھی اپنے تجربات سے دریافت کیا ہے، تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ ذات کو موت نہیں آسکتی؛ یہ صرف طبیعی وجود کو آتی ہے جو ایک مادی حالت میں زندہ ہے اور زمان و مکان کی حدود کا اسیر ہے۔

یہاں پھر ایک بار حضرت علامہ اقبال کی فکرِ عمیق سے کچھ جواہر پارے پیش ہیں جو ہمارے موضوع کو اجاگر کرتے ہیں:

''ارض و سماء، پستی و بلندی کا تصور تو موجودہ شعور کے تابع ہے۔ جب شعور بدل جاتا ہے تو زمان و مکان [time and space] کے تصورات بھی بدل جاتے ہیں۔ اگلی منزل میں شعور بدل جائیگا۔ کیا معلوم ارض کیا ہو اور سماء کیا ہو۔ یا دونوں ایک ہی ہوں۔ اسی لیے تو فرمایا کہ [۱۴/۴۸: یومَ تُبدّلُ الارضُ غیرَ الارضِ والسمٰوٰت ۔ جس دن یہ ارض و سماوات بدل جائینگے]۔ شعور کی ارتقائی منازل کا تقاضا ہے کہ زمان و مکان کے بُعد باقی نہ رہیں۔ خواب میں دونوں چیزیں

باقی نہیں رہتیں۔ نہ وقت کوئی شے رہتا ہے نہ مکان۔"

قارئین، یہاں حضرت علامہ مراحلِ حیات کے تناظر میں درجہ بدرجہ بلند تر ہوتی ہوئی شعوری اقدار ہی کی بات کر رہے ہیں اور اس امر کے امکان کی تصدیق فرماتے ہیں کہ آئندہ مرحلہِ حیات زمان و مکان کے قوانین سے ماوراء اور بلند تر سطح پر قائم ہوگا۔

ذات یا شخصیت کا واقعات اور خیالات کو محفوظ کر لینا مزید ظاہر کرتا ہے کہ وہ ساز و سامان یا وہ نظام جس کے ساتھ ذات قریبی طور پر وابستہ ہے، طبیعی وجود کا پیدا کردہ نہیں ہے۔ جیسا کہ ماقبل میں زیرِ بحث لایا گیا، یہ اس وجہ سے ہے کہ طبیعی وجود مسلسل تبدیلی کی زد میں رہتا ہے۔ ہر تین سال بعد وجود کے خلیات مکمل طور پر نئے خلیات سے بدل جاتے ہیں اور بعد ازاں ایک خاص عمر تک پہنچنے پر وہ زوال اور شکست و ریخت کا شکار ہو جاتے ہیں اور آخر کار وجود کے بکھر جانے پر منتج ہوتے ہیں۔ تاہم، ہم ذات کے ذہنی نظام میں کوئی تبدیلی یا کمتری کا رجحان نہیں پاتے، جہاں فرائڈ کے مطابق دہائیاں گذر جانے کے بعد بھی تمام واقعات، خیالات اور اعمال اس طرح محفوظ کر لیے جاتے ہیں گویا کہ ابھی حال ہی میں واقع ہوئے ہوں۔

آخری فیصلہ

قارئین، ہم حیات کے اہم ترین پہلوؤں پر تحقیق کر چکے ہیں اور نتیجتاً کچھ بہت اہم فیصلوں تک پہنچے ہیں۔ مثلاً یہ کہ نباتاتی اور حیوانی مراحلِ تخلیق پر حیات کی شعوری اقدار بیج اور جرثومے کی صورت میں محفوظ کی گئی ہیں۔ اور یہ کہ اقدار کے اس تحفظ کا مقصد اُن مراحل میں حیات کے تسلسل کو یقینی بنانا تھا۔ اُن مراحل میں حیات قابلِ انتقال تھی کیونکہ حیوانی مرحلے تک حیات ابھی خود سے آگاہ نہ تھی اور اسی لیے مادی حالتوں میں موجود تھی۔ یہ اپنی اقدار صرف عملِ پیدائش کے ذریعے بچا سکتی تھی۔ تاہم انسانی مرحلے میں انسانی ذات نا قابلِ انتقال تھی۔ اسی لیے یہ اپنے اُس حیوانی وجود کی موت کے بعد بھی حیات کا تسلسل قائم رکھ سکتی تھی جو تبدیل ہونے اور ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جانے کا ہدف تھا۔

نباتاتی اور حیوانی مراحل میں حیات خود آگاہ نہ تھی اور اس لیے ایسی اکائیوں کی تنظیم میں رہتی تھی جو طبیعی وجود کے ذریعے اپنی اقدار بآسانی منتقل کر سکتی تھیں۔ مثلاً، نباتاتی مرحلے میں پودے کا بیج مکمل پودے پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسی طرح حیوانی مرحلے میں جرثومہ مکمل طور پر حیوان کی جبلی اور شعوری اقدار کو محفوظ رکھتا ہے اور دوبارہ پیدا کرتا ہے۔ انسانی مرحلے میں اگرچہ انسان کا طبیعی وجود بھی جرثومہ کے ذریعے دوبارہ پیدا ہوتا ہے، مگر شعوری ذات جو اپنی ذہنی حالت میں رہتی ہے اور حیوانی وجود سے بالکل الگ ہے، نہ دوبارہ پیدا ہو سکتی ہے اور نہ ہی بیج یا جرثومے کے ذریعے منتقل ہو سکتی ہے۔ شعوری ذات ایک یگانہ ہستی کے طور پر نمودار ہوتی ہے جہاں اس کے تمام خیالات، نظریات اور اعمال مکمل محفوظ رہتے ہیں جیسے کہ درخت کے پتے، ٹہنیاں اور تنا بیج کے اندر رہتا ہے۔ تخلیق کا اولین اصول ہمیں

یہ بتاتا ہے کہ حیات اپنی سطح سے نہ کبھی نیچے آتی ہے اور نہ ہی اپنی اقدار کو کھوتی ہے۔ اس لیے ہر ذات اپنی شعوری حیات کو محفوظ رکھتی ہے۔ شعوری اقدار کا تحفظ لایعنی ہو جاتا ہے اگر اس کا مقصد حیات کا تسلسل قائم کرنا نہ ہو۔ پس انسانی ذات مر ہی نہیں سکتی۔ یہ حیات کے تخلیقی طریق کار ہی کے خلاف ہے۔

انسانی مرحلے سے قبل کے تمام مراحل کا مقصد خود آ گاہ ذات کی تخلیق تھی۔ سابقہ مراحل میں حیات نے تبدیل اور تعمیر ہونے کا عمل قدم بہ قدم جاری رکھا۔ اُن تبدیلیوں کا مقصد، نیز موت اور پیدائش کے سلسلے کا مقصد، پیہم تلاش کرنے اور حقیقتِ مطلق تک پہنچنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر مرحلے میں حیات غیر معینہ طور پر جاری رہتی اور اسطرح بذاتِ خود ایک وجود کی حیثیت سے اُبھر آتی۔ اس لیے ہم یہ حقیقت نظر انداز نہیں کر سکتے کہ تمام سابقہ مراحل، یا دوسرے الفاظ میں، تمام کائنات اس لیے بنائی گئی کہ انسان کی تخلیق ہو سکے۔ اپنے ماخذ کو پہچان لینے کے بعد، حیات انسان کے اندر اپنے خالق کے اظہار کے طور پر ابدی قیام کرنے آ گئی، جہاں وجود کی طبیعی موت درحقیقت اس کے لیے حیات کے نئے اُفق کھولتی ہے جو خواہشات اور کشش سے پُر ہوتے ہیں۔

انسانی ذات یا روح ابھی بھی تکمیل کے مراحل میں ہے،،،،،،،، اقبال کے الفاظ میں:

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی　　　نقش گرِ ازل، ترا نقش ہے ناتمام ابھی

،،،،،،،، اور جب تک خالق خود کو انسان کے اندر اپنے متعین کردہ انداز میں پوری طرح بارز نہیں کر لیتا، شعوری ذات پابند ہے کہ جدوجہد کرتی رہے اور اپنے خالق کی صفات زیادہ سے زیادہ اپنے اندر پیدا کرے اور اس طرح اس کے قریب تر پہنچ جائے۔

زندگی صرف صحیح آئیڈیل کی پیروی میں ہی آگے بڑھ سکتی ہے۔

طبیعی وجود کو ترک کر دینے کے بعد انسانی روح یا ذات اپنی خالص نفسیاتی یا روحانی حالت میں منتقل ہو جاتی ہے۔ تاہم روح اپنی نفسیاتی دنیا کی تعمیر صرف اُن اعمال کی روشنی میں کر سکتی ہے جو اس نے اپنی موجودہ حیات میں سرانجام دیے ہوں۔ انسان اپنے آئیڈیلز کے ساتھ زندہ ہے۔ حتٰی کہ وہ بھی جو اپنے اس اندرونی نفسیاتی تقاضے کا انکار کرتے ہیں، پہلے ہی اپنے آئیڈیل کے ساتھ رہ رہے ہوتے ہیں، خواہ اُن کا آئیڈیل کمتر ہو یا ایسی منفی اقدار پر اساس رکھتا ہو جن کی بنیاد اپنی ذات کو مکمل نظر انداز کرنے پر ہو۔ ذات بہر حال ایک دائمی تسکین تبھی حاصل کر سکتی ہے جب اس کا آئیڈیل اُس کے اپنے ہی صفات پر مبنی ہو۔ یہ اس لیے کہ حقیقی تسکین کبھی حاصل نہیں ہو سکتی اگر آئیڈیل ان معیاروں اور صفات سے محروم ہو جو ذات یا روح میں نقش ہیں۔ مثلاً انسانی ذات آزادی کی حامل ہے۔ یہ فیصلے کرتی ہے اور یہ خود سے آگاہ ہے۔ یہ محبت اور کشش کے وصف رکھتی ہے اور یہ لامحدود سے بھی آگاہ ہے۔ اسی کے مطابق صحیح آئیڈیل

لازماً انہی صفات کا حامل ہونا چاہیئے جو روح میں موجود ہیں۔ اس سے ہمیں یہ راہنمائی ملتی ہے کہ صرف ایسے آئیڈیل یا نظریے جو انسانی ذات کی صفات پر مبنی ہوں، ذات کو خود کی شناخت دے کر تسکین دینے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

آئیڈیل، یا قابلِ تقلید تصوراتی پیکر، انسانی ذات کا نصف ہے اور یہ روح میں اُن دو اجزاء کی مانند رہتا ہے جو ایک بیج کی اکائی میں رہتے ہیں۔ اگر ہم آئیڈیل کو زندگی سے نکال لیں، انسانی ذات قائم نہیں رہ سکتی۔ یعنی یہ خود کو کبھی جان ہی نہیں سکتی۔

اگر چہ انسانی تقاضہ اُس خالق کی تلاش اور اُس سے محبت ہے جس کا عکس وہ خود کے اندر پاتا ہے، پھر بھی وہ ابھی تکمیل کے سفر میں ہے۔ اور وہ اپنی آزادی کے تحفے کا غلط استعمال کر سکتا ہے۔ اور کچھ غلط آئیڈیل منتخب کر کے ان کی پیروی اختیار کر سکتا ہے۔ انسان کو خالق نے اپنے پیغام بروں اور انتہائی باشعور انسانوں کے ذریعے راہنمائی مہیا کی ہے جنہیں اُس نے تخلیقی طریق کار کے تحت پیدا کیا ہے۔ اس لیے وہ لوگ جو مختلف نظریات کا اتباع کرتے ہیں دراصل انسانوں کی ایک مختلف صنف کی حیثیت میں زندہ ہیں۔ تخلیقی طریقِ کار کے مطابق صحیح نظریہ صرف ایک ہی ہے، ایسے ہی جیسے کہ سچائی صرف ایک ہی ہوتی ہے، لیکن جھوٹ کی بہت سی شکلیں ہوتی ہیں۔

لہذا شعوری روشنی کا آئندہ مرحلہ ان روحانی اقدار پر تعمیر یا شروع ہوگا جو صحیح نظریے کے متبعین نے حاصل کی ہونگی۔ تمام دوسری اصناف کو ایک طبعی نتیجہ کا سامنا کرنا ہوگا۔

دوسرے الفاظ میں وہ جو موجودہ مرحلہ حیات میں اندھے رہے اُس روشنی کو نہیں دیکھ سکیں گے جو آئندہ آنیوالے بلند تر مرحلے میں نمودار ہوگی۔،،،،،،،، خالق کا فرمان ہے:

"۷۲/۱۷: ومن کان فی ھذہ اعمیٰ فھو فی الآخرۃ اعمیٰ۔۔"۔ ترجمہ: جو اس زندگی میں اندھے رہے وہ آخرت کی زندگی میں بھی اندھے ہی ہونگے۔

ایسے لوگوں کو خود کو اُس شعوری روشنی تک پہنچنے کے قابل بنانے کے لیے سخت ذہنی اور روحانی اذیت سے گزرنا ہوگا۔ یہ اس دنیا میں اُن بہت سی حیوانی اصناف کی مانند ہیں جو شعوری طور پر اندھی ہوتی ہیں، اگر اُس شعوری روشنی سے اُن کا موازنہ کیا جائے جو انسان کو عطا ہوئی ہے۔

غلط نظریات جو انسانی ذات کی روحانی اقدار کی نفی کرتے ہیں، انسانی ذات کو اندھا رکھتے ہیں۔ ایسے نظریات کے پیروکار تخلیق کے اُلٹے طریقِ کار [Reverse process] پر یقین کرتے ہیں، یعنی وہ خود کو مادی قوتوں کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ یہ وہ انسان ہیں جو اپنی روحوں یا ذات کو ہمیشہ کے لیے فنا کے گھاٹ اتار دینے کا نظریہ یا رجحان رکھتے ہیں اور اس وجہ سے وہ آئندہ مرحلے کی روحانی اقدار کو کبھی حاصل نہ کر پائیں گے۔،،،،،،، خالق کا فیصلہ تو یہ ہے:

"۲/۱۶۷ : وما ھم بخارجینَ من النار"۔۔ ترجمہ: پھر وہ کبھی اُس آگ سے باہر نہ آسکیں گے۔

،،،،،،،، یہ تخلیقی عمل کا بنیادی اصول ہے کہ حیات صحیح شعوری اقدار پر شروع ہو اور پیش قدمی کرے۔ اگلے مرحلے کی شعوری روشنی خالق کی

عظمت وشان کی روحانی روشنی ہے۔ اور اس طرح انسانیت کا صرف وہ حصہ جس نے خالق پر بھروسہ کیا، اُسی کی ذات کو اپنا مطلق آئیڈیل بنایا، اور اپنی ذات کی دُرست سمت میں افزائش کی، آئندہ بلند تر مرحلے میں شان وعظمت کی روشنی دیکھ سکے گا۔

لہذا ان لوگوں کے لیے یہی درست وقت ہے جنہیں اس دنیاوی زندگی کا تحفہ ملا ہے کہ وہ زندگی کے آئندہ سفر میں ایک ہموار پیش قدمی کرنے کے لیے صحیح نظریے کا انتخاب کریں۔ علامہ نے اپنی فکرِ عمیق سے انسانِ کامل کے لیے ایک معیار متعین فرمایا تھا۔
براہِ کرم لفظ کافر کو انتہائی معنی میں تحقیر کی بجائے نظریاتی تناقض میں لیتے ہوئے غور فرمائیں، ممنون ہوں گا:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گُم اس میں ہیں آفاق

والسلام۔۔۔۔۔اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی بے پایاں رحمتیں نازل فرمائے۔
